“JAMMU WA KASHMIR KE AFSANOUN MEIN TARRAQI PASAND TAHREEK KE ASRAAT”

Dissertation

A dissertation Submitted to the University of Hyderabad in partial of fulfillment of the requirement for the award of degree of

MASTER OF PHILOSOPHY
IN URDU

Submitted

By

ABDUL RAZAQ CHAITI

Reg.No:18HUHL01

Under the Supervision

Of

DR. ARSHIA JABEEN

Department of Urdu, School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad 500 046

2019

جموں و کشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات

مقالہ برائے

ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

عبدالرزاق چیٹی

E.No. 18HUHL01

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومانیٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

2019

جموں و کشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات

مقالہ برائے

ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

عبدالرزاق چیٹی

E.No. 18HUHL01

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومانیٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

2019

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad.
Hyderabad - 500 046.

DECLARATION

I, **ABDUL RAZAQ CHAITI**, hereby declare that this dissertation entitled **"JAMMU WA KASHMIR KE AFSANOUN MEIN TARRAQI PASAND TAHREEK KE ASRAAT"** submitted by me under the guidance and supervision of **DR. ARSHIA JABEEN**, is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other Institutions for award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Name: **ABDUL RAZAQ CHAITI**

Signature of the Supervisor

Signature of the Student
Regd. No: 18HUHL01

CERTIFICATE

This is to certify that the Dissertation entitled **"JAMMU WA KASHMIR KE AFSANOUN MEIN TARRAQI PASAND TAHREEK KE ASRAAT"** submitted by **ABDUL RAZAQ CHAITI**bearing registration number **18HUHL01** in partial fulfillment of the requirement for the award of degree of **Master of Philosophy** in **Urdu** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This Dissertation has not been submitted previously in part or full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Signature of the Supervisor

Countersignature

Head of the Department

Dean
School of Humanities

﴿فھــــرست﴾

پیش لفظ:	2
باب اول:	6
اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا	
باب دوم:	44
اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات	
باب سوم:	69
جموں وکشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات	
ماحصل	129
کتابیات	139

پیش لفظ

پیش لفظ

اردو زبان و ادب کی ترقی میں تحریکات اور رجحانات کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ مختلف سماجی، اصلاحی اور ادبی تحریکات ہر دور میں سرگرمِ عمل رہی ہیں۔ اردو ادب میں رونما ہونے والی تحریکات اور رجحانات نے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا بلکہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں بھی ادبی تحریکات اور رجحانات کے زیر اثر کئی افسانے لکھے گئے ہیں۔ جن میں رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا رجحان شامل ہے۔ لیکن ان چاروں میں سب سے زیادہ کامیاب اور متاثر کرنے والی تحریک ترقی پسند تحریک کے طور پر اُبھری ہے۔

میرا جتنا لگاؤ اردو افسانے سے تھا اتنا کسی اور صنف سے نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کو جب میں نے ایم۔اے کے دوران پڑھا تو کافی حد تک متاثر ہوا۔ ایک سوال میرے ذہن میں ہمیشہ اُٹھتا رہا کہ کیا ہماری ریاست کے افسانہ نگاروں نے بھی ایسے کارنامے انجام دیے ہوں گے جس طرح کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی نے دیئے ہوں گے۔ اگر دیئے ہیں تو ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں میں اُن کا نام کیوں نہیں گِنا گیا؟۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور اپنی نگران ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ سے اس موضوع پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُن کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری دلچسپی کو ترجیح دی اور آخر کار میں نے ''جموں وکشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات'' کے عنوان سے موضوع کا انتخاب کیا۔ اس کے علاوہ صدر شعبۂ پروفیسر حبیب نثار

صاحب اور دیگر کمیٹی کے اساتذہ کرام کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس موضوع کو قبول کیا۔

اس موضوع کو میں نے اپنی نگران کے مشورے سے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول میں ''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز و ارتقا'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم میں نمائندہ افسانہ نگاروں کے حوالے سے ''اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات'' کے تحت جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں ''جموں و کشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ایم۔فل کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا وہ مکمل کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔اپنی اس کوشش کے سلسلے میں، میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تحقیق وتنقید میں کوئی بات حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی ہے۔میں نے اپنی طرف سے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی ازحد سعی کی ہے۔پھر بھی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔

شکریہ کے فرائض میں، میں سب سے پہلے اپنی نگراں ڈاکٹر عرشیہ صاحبہ کا شکر گزار ہوں ۔جنہوں نے مقالے کی تیاری کے دوران بھرپور رہنمائی کی۔

اس کے علاوہ اساتذہ کرام میں پروفیسر حبیب نثار صاحب، پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صاحب، ڈاکٹر محمد کاشف صاحب، ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر محمد نشاط اور ڈاکٹر رفعیہ بیگم صاحبہ کا مشکور وممنون ہوں۔جن کی دعائیں اور نیک تمنائیں مجھے حاصل رہی۔

ریاست جموں و کشمیر کے مشہور ومعروف فکشن نگار نور شاہ صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔اس کے علاوہ کشمیر یونی ورسٹی کی مرکزی لائبریری (علامہ اقبال لائبریری)، جموں یونی ورسٹی کی مرکزی لائبریری، اردو کلچرل اکیڈمی اور ایس۔پی لائبریری کے کارکنوں کا

شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے بعض رسائل اور کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں اپنے خصوصی تعاون دیا۔

میں اپنے والدین کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے تعلیم جیسی دولت سے نوازا۔جن کی محبت، پُر خلوص دُعائیں اور نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں۔ان کے لیے لفظ ''شکریہ'' ناکافی ہی نہیں بلکہ بے معنی سا لگتا ہے۔بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ مختصر سا لفظ ان کی بے انتہا محبت وخلوص کا بدل نہیں ہوسکتا۔

یہاں میں اپنی ماسی جی کو کیسے بھول سکتا ہوں جنھوں نے ماں جیسا پیار دیا اور ہمیشہ دُعائیں دیتی رہیں۔میری یہی دُعا ہے کہ اللہ ان کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹوں کی سجاوٹ رکھے۔

برادرانِ محترم شبیر احمد، محمد رفیق، عرمان اور ظفر کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کیا جائے جن کی پُر خلوص ہمت افزائی، مالی مدد اور غیر معمولی توجہ کے بغیر اس مقالے کی تکمیل میرے بس میں نہ تھی۔اس کے علاوہ اپنی بہنوں اور بھابیوں کا بھی بے حد مشکور ہوں۔جنھوں نے ہمیشہ ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔

اپنے دوستوں میں محمد زبیر، شیراز احمد، سبزار سکندر، جاوید احمد، ارشد کسانہ، ذاکر احمد کمار، مدثر احمد گنائی، محمد یوسف، خالد محمود، محمد ظفر، لیاقت حسین، محمد شاکر اور اظہر جمال کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں میری مدد کی۔اللہ تعالیٰ میرے تمام دوستوں کو سلامت رکھے۔ آمین

عبدالرزاق

ایم۔اے

باب اوّل

﴿اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا﴾

اردوادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا

پس منظر:

علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری بڑی تحریک جس نے ہمارے ادب کو انقلابی تبدیلیوں سے دو چار کیا، ترقی پسند تحریک تھی۔ اس تحریک کے زیراثر اردوادب کو کافی فروغ ملا۔ کئی ادیب، شاعر اور نقاد اس تحریک سے جڑے رہے اور اردوادب کی ترقی وترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے سلسلے میں انقلاب روس کا واقعہ تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان پر بھی اس واقعہ کے گہرے اثرات پڑے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں تیزی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری طرف ہندو مسلم اختلافات میں اضافہ ہوا۔ اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے آثار سے پورے مغرب میں ہلچل اور مایوسی کی فضا چھانے لگی۔ جس کی بنا پر حساس نوجوان طبقہ میں اشتراکی رجحانات پیدا ہونے لگے۔

شاعروں اور ادیبوں نے ٹالسٹائی کے برعکس لینن اور کارل مارکس کے اثر کو قبول کیا۔ جب کہ روسی ادب کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کی حیثیت افیون کی سی ہے۔ مذہب باطل تصور ہے۔ انسان کے سب سے بڑے مسائل معاشی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح ادب کے روح سے تعلق جوڑتا ہوا مذہب انسانیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظریات ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سبب بنے۔

دوسری طرف ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم نے سر اُٹھایا، جس کی وجہ سے پورے یوروپ کو ایک سیاسی بحران سے گزرنا پڑا۔ ہٹلر نے جرمنی میں تہذیب وتمدن کی اعلیٰ اقدار پر حملہ

کیا۔ بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کیا گیا۔ اُن شعراو ادبا میں آئن سٹائن اور ارنسٹ ووکر بھی شامل تھے۔ ہٹلر کے اس اقدام پر جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں بعض شہرہ آفاق شخصیتوں مثلاً ہنری باربس، میکسم گورکی، رومین رولاں بارتھ، ٹامس مان، آندرے مارلو اور والڈو فرینک نے ثقافت کے تحفظ کے لیے دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی، اور اس کانفرنس کا نام (The world (Congress of the writers for the defence of the culture رکھا۔

اگرچہ ہندوستان سے کسی بڑے ادیب نے اس کانفرنس میں شرکت نہیں کی البتہ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اس طرح بعد میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے کچھ دیگر ہندوستانی طلبہ کی مدد سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کا صدر ملک راج آنند کو منتخب کیا گیا۔ اس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین جو ترقی پسند تحریک کے نام سے وجود میں آئی۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ ترقی پسند تحریک کا سرچشمہ انقلاب روس تھا۔ لندن میں مقیم چند نوجوانوں کے اس گروہ نے ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی جلسے کا اہتمام کیا۔ اس میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر پرمود سین گپتا، اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ انھوں نے ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن قائم کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس کا پہلا جلسہ لندن کے نان کنگ ریستوران میں منعقد ہوا اور اس انجمن کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' (IndianProgressive Writer's Association) رکھا گیا۔

اسی دوران یوروپ کے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی فاشزم کے مقابلے کے لیے دنیا کے ادیبوں کی کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس میں ساری دنیا کے ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کی گئی کہ وہ

فسطائی اور سامراجی طاقتوں کے ظلم سے انسانیت کو بچانے کے لیے اپنے قلم اور فن کی قوت سے کام لیں۔ اس میں برطانوی سامراج پر شدید مذمت کی گئی کہ وہ ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پُرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں۔ اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔ انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے تاکہ ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر پُر زور طریقے سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی و تنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی، بدحالی، سماجی پستی سیاسی اور غلامی کا سوال ہے۔ ان مسائل کو ہم تب ہی سمجھ سکیں گے جب ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔ ترقی پسند تحریک کو ماننے والے اس بات پر بھی اتفاق کرتے تھے کہ وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایت کو عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہیں گئے۔ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر اس انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز منظور کیے:

(۱) ''ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ ان

انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعہ ربط وتعاون پیدا کرنا،صوبوں کی،مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

(۲) ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت منداور توانا ہو۔جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

(۴) ہندوستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم خط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(۵) فکر ونظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

(۶) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا،عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں۔'' [۱]

اس مینی فسٹو کو ہندوستان میں سب سے پہلے پریم چند نے قبول کیا اور اسے اپنے رسالہ ''ہنس'' میں شائع کر کے ایک اداریہ لکھا جن میں ان مقاصد کی حمایت کی اور کہا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔بظاہر ترقی پسند تحریک کے مقاصد ایسے تھے جس سے کسی ادیب یا شاعر کو اختلاف نہ تھا۔چنانچہ ۱۹۳۵ء کی ہندوستانی اکیڈمی کانفرنس الہ آباد میں مولوی عبدالحق،منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے اس مینی فسٹو پر دستخط کئے۔الہ آباد میں ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے ساتھ ہی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوگئیں۔اپریل ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں

منعقد ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور انھوں نے صدارتی خطبہ پڑھا۔

ترقی پسند مصنفین کی یہ تحریک اس قدر مقبول عام ہو چکی تھی کہ ہر طرف اس کا چرچا ہو رہا تھا۔ یہ ہندوستان کی وہ ادبی تحریک تھی، جس میں نہ صرف اردو کے ادیب شامل تھے بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی شامل تھے۔ ایسی صورت میں اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی ایسی کانفرنس بلائی جائے جہاں ملک کے سارے ادیب جمع ہو کر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کریں اور ادب اور ادیبوں کے مسائل پر غور و خوص کرنے کے بعد انجمن کی سرگرمیوں کے لیے عمل تیار کریں۔

اس کانفرنس کو بلانے والوں کے سامنے ایک طرف یہ مقصد تھا کہ انجمن کا دستور مرتب کیا جائے اور اس کی کل ہند مرکزی تنظیم قائم کر لی جائے اور دوسرا یہ کہ تمام زبانوں کے ادیب جمع ہوں اور ہر زبان کے جدید ادب پر مقالے پڑھے جائیں، تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس وقت ملک کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں میں کون سے ادبی مسائل درپیش ہیں اور کون کون سے رجحانات پرورش پا رہے ہیں۔ ادیبوں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے ناواقف تھے۔ اس کانفرنس کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ حکومت کی پالیسی کی بنا پر ہمارے ادیبوں کو کچھ تحریر کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور نہ ہی ادبی کاموں کا کوئی صلہ ملتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اعلیٰ اور صحت مند خیالات پر پابندی لگائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ پوری دنیا میں سرمایا دارانہ نظام کے سیاسی بحران سے تہذیب اور کلچر کو جو خطرات درپیش ہیں، اس کے لیے ادیبوں کو کیا کرنا چاہیے۔ سجاد ظہیر اور ان کے رفقا کے سامنے یہ مسئلہ واضح تھا مگر وہ چاہتے تھے کہ سارے ادیب جمع ہو کر سوچیں اور کوئی نقطہ نظر اختیار کریں۔

اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترقی پسند ادیبوں نے یہ کانفرنس لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں قائم کی۔ اس کانفرنس میں استقبالیہ کمیٹی کے صدر اردو کے پُرانے صاحبِ طرز ادیب اور اودھ کی تہذیب

اور شائستگی کی آخری یادگار چودھری محمد علی ردولوی چنے گئے۔ چودھری صاحب معمراور قدیم شریفانہ وضع رکھنے کے باوجود خیالات کے اعتبار سے ترقی پسند تھے۔اور نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔

اس کانفرنس میں شامل پریم چند کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، جے پرکاش نرائین، کملا دیوی چٹوپادھیائے، میاں افتخارالدین، یوسف مہر علی اور اندولال وغیرہ نے شرکت کی۔اس کے علاوہ اس کانفرنس میں بنگال، گجرات، مہاراشٹر اور مدراس کے ادیب بھی شامل ہوئے۔اس کانفرنس کی دو چیزیں اردو ادب میں اہمیت رکھتی ہیں۔ایک وہ ''اعلان نامہ'' جو ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنی پہلی کل ہند کانفرنس میں پیش کیا اور دوسرا پریم چند کا صدارتی خطبہ جس نے رومانیت پسندوں کو حقیقت پسندی سے کام لینے پر مجبور کیا۔اعلان نامہ کچھ اس طرح تھا:

> ''ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کو ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہیں۔
>
> ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لیے زندگی کے جس شعبے میں ردِعمل کے آثار پائیں گے انھیں افشا کریں گے۔ہم انجمن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب وتمدن سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔یہ

بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جارہے ہیں۔ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔تغیر اور ترقی کا ذریعہ قبول کرتے ہیں۔

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرکے اور لٹریچر شایع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کرکے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پزیر مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادی رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔'' ۲؎

اس کے بعد پریم چند کے اس خطبے سے ترقی پسند تحریک کو ایک نئی روشنی اور توانائی حاصل ہوئی،اس خطبے میں پریم چند نے پُرانے ادب پر تنقید کی اور نئے ادب کا مقصد واضح کیا۔ادب اور افادیت کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فن کو افادی نقطہ ءنظر سے جانچنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا:

''ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے، ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔'' ۳؎

پریم چند کے اس صدارتی خطبے کے بعد اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرتؔ موہانی نے تقریر کی۔ انھوں نے اس علان نامے اور ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے پورا اتفاق کیا اور ترقی پسندی کے ساتھ سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنے پر زور دیا۔ پیش ہے ایک اقتباس:

''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انھیں خیالات کو ترویج کرنا چاہیے۔'' [۴]

مولانا حسرتؔ موہانی اپنی اس تقریر کو ختم کرتے ہوئے آخر میں اپنی شاعری سے اتفاق کرتے ہوئے اسے دل بہلانے کا ذریعہ بتایا اور ادب کو اس طرح کی شاعری کی تقلید کرنے سے منع کیا اور وقت کی ضرورت کے تحت ادب کو ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنے کی تلقین کی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ:

''آپ سوچتے ہوں گے کہ جب میں ادیبوں کے سامنے یہ نصب العین پیش کر رہا ہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی لیکن آپ کو اس کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرفداری اور حمایت کا اعلان کروں جو آپ نے اپنے علان نامے

میں لکھے ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اسی قسم کے ادب کی تخلیق ہو۔پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا۔'' ۵

لکھنؤ کی اس پہلی کل ہند کانفرنس کے بعد ملک میں جابجا اس تحریک کے چرچے عام ہونے لگے اور ملک کے ادیب اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔منشی پریم چند نے اپنا صدارتی خطبہ اردو سے ہندی میں ترجمہ کر کے رسالہ ہنس میں جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔اس کے بعد پٹنہ، بنارس، ناگپور وغیرہ میں ہندی اور اردو ادیبوں کو اس تحریک کی طرف مائل کیا۔

پریم چند کے علاوہ دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے بھی اس انجمن کی شاخ قائم کی۔وہ اس زمانے میں مولوی عبدالحق سے الگ ہو کر دہلی میں مقیم تھے۔جوش ملیح آبادی وہاں سے رسالہ ''کلیم'' نکالتے تھے۔ان سب نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم حصہ لیا۔ان کے علاوہ ڈاکٹر عابد حسین کی سرپرستی بھی اس تحریک کو حاصل رہی۔اور شاہد احمد دہلوی مدیر ''ساقی'' نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کے یہاں جلسے ہوتے تھے۔شاہد احمد نے اس انجمن کے مقاصد کے لیے ایک الگ ماہنامہ ''شاہجہاں'' بھی جاری کیا۔

اس کے علاوہ کانپور میں بھی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی اور مولانا حسرتؔ موہانی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔اس کے بعد پنجاب میں (امرتسر) کے تاریخی مقام پر کسان سبھا کا ایک جلسہ ہوا۔اس موقع پر ترقی پسند ادیبوں نے بھی اپنی ایک کانفرنس کی اور اس تحریک کی آواز عوام تک

پہنچائی۔اس کانفرنس کے صدر فیضؔ احمد فیض تھے۔ان کے علاوہ سجاد ظہیر،ڈاکٹر محمد اشرف، چراغ حسن حسرتؔ،ڈاکٹر تاثیر، پروفیسر محبّ الرحمٰن ، فیروزالدین منصور،ٹیکا رام سخن، پروفیسر سنت سنگھ، پروفیسر رگھونش کمار،اور رگھوپتی چوپڑاوغیرہ اردواور پنجابی کےادیب اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔اس سفر کے دوران سجادظہیر اورڈاکٹر اشرف نے لاہور کا سفر بھی کیا اور وہاں علامہ اقبالؔ سے ملاقات کی اوران کے سامنےاس تحریک کے مقاصد رکھے۔علامہ اقبالؔ نے بڑی ہمت افزائی کی اور کہا:

''ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔آپ لوگ مجھ سے ملتے رہئیے۔'' ۶

اس کے بعد ملک میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی انجمنیں قائم کرنے لگے۔کلکتہ میں بنگالی ادیبوں نے اپنی شاخیں قائم کیں۔اس کے علاوہ سلہٹ،گوہاٹی، ناگپوراور پونا میں بھی ترقی پسندوں نے اپنے حلقے قائم کیے۔احمد آباد میں بھوگی لال گاندھی، ہیرالال گودی والا اوراد ماشنکر جوشی جوگجراتی زبان کے ادیب تھے ان کی کوششوں سے گجراتی کے ادیبوں میں اس تحریک کوفروغ ہوا۔اس کے علاوہ ملیالم اور تلگو کے ادیبوں نے بھی اس نظریے کو اپنانا شروع کیا۔اس طرح یہ ہندوستان گیر حیثیت اختیار کرنے لگی۔

ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۳۷ء میں الہ آباد میں ایک کانفرنس منعقد کی۔سنگم کے اس شہر میں اردو اور ہندی کے قلم کاروں کا یہ حسین سنگم ایک یادگار واقعہ رہا ہے۔اس کانفرنس میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رہنما جے پرکاش نرائن نے بھی شرکت کی۔ ہندی زبان کے قلم کاروں میں جنیند کمار،شیودان سنگھ چوہان،نریندر شرما،رمیش چندرسنہا،خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔اس مجلس کی صدارت کرنے والوں میں ،پنڈت رام نریش،اچاریہ نریندر دیو، پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق کے نام منتخب کیے

گئے۔ اچاریہ جی اور ترپاٹھی جی نے ترقی پسند ادب کی حمایت میں تقریریں کیں۔ مولوی عبدالحق خود تو آ نا سکے لیکن اپنا خطبہ صدارت بھیج دیا۔ اس خطبے میں مولوی عبدالحق نے ترقی پسند ادیبوں کی ہمت افزائی کی اور بہت سے قیمتی مشوروں سے نوازا:

> ''ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرارت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت اور ہردلعزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کے خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کے معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے اور اگر ابتدا میں یہ بدگمان پیدا ہو گئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔ بنیاد اگر بگڑ گئی تو عمارت کا خُدا حافظ ہے۔'' ۷

الہ آباد میں پہلی کانفرنس منعقد کرنے کے بعد اگلے سال پھر ادب کی ترویج کے لیے ایک اور کانفرنس منعقد کی گی جو مارچ ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں یوپی، بہار، اور پنجاب کے ادیب شریک ہوئے۔ لاہور سے فیض احمد فیض اور لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالحلیم جو علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ یونی ورسٹی میں آ گئے تھے۔ ان کے علاوہ حیات اللہ انصاری، مجاؔز، علی سردار جعفری، آنند نراین ملاّ، بنارس سے پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے اور ہندی کے ادیب سریندر بالو پوری، علی گڑھ سے شاہد لطیف، اور علی اشرف آئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر اعجاز حسین، فراق، اور وقار عظیم وغیرہ موجود تھے۔ اس کانفرنس کی صدارت جوش ملیح آبادی، آنند نراین ملاّ اور ہندی کے مشہور شاعر سمترا نندن پنت نے کی۔ اس کانفرنس کی دو چیزیں تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ ایک تو پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر اور دوسرا ہندوستان کے

عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے ترقی پسند ادیبوں کے نام ایک پیغام بھیجا۔ نہرو کی تقریر کا ایک اقتباس جس میں انھوں نے انفرادی طور پر ترقی کی راہیں ہموار کرنے کی بات کی ہے:

> ''اگر انفرادیت ترقی پا سکتی ہے تو وہ صرف سوشلزمی سماج میں پچھلی دنیا میں پھر بھی ان لوگوں کو موقع حاصل تھا جو روپیہ پیسہ رکھتے تھے۔ اور اختیارات رکھتے تھے لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا کہ سوشلزم آ کر انفرادیت کو فنا کر دے گا غلط ہے۔ وہ دور ایسا نہیں ہوگا کہ ایک ہو جائیں بلکہ ہر ایک کو اپنے ڈھنگ پر ترقی کرنے کے موقع حاصل ہوں گے۔''

۸

نہرو کے بعد ٹیگور ادب اور انسانیت کے گہرے تعلق پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ادب کا انسانیت سے اہم آہنگ ہونا ضروری ہے، ورنہ ادب کو کامیابی نہیں ملے گی اپنے انہیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانہ دراز تک سماج سے الگ اپنی ریاضت میں، میں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضہ ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے، اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔'' ۹

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کا یہ ماننا تھا کہ تخلیق ادب کے معاملے میں تنہائی جتنی مفید ہوتی ہے۔ سماج اور زندگی سے ہٹ کر ادیب بیگانہ محض بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس امر کا اظہار کیا۔

الہ آباد کی کانفرنس کے بعد دہلی اور ہری پورہ میں بھی دو جلسے اہم ہوئے۔ دہلی کے جلسے میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالحلیم، سومندرا ناتھ ٹیگور، اندولال اور فیض احمد فیضؔ وغیرہ شریک ہوئے۔ اس جلسے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کونسل نے اسپین کے جمہوریت پسندوں کی حمایت اور فاشسٹ فرانکو کی مخالفت میں ایک قرارداد پاس کی اور جمہوری اسپین کی امداد کے لیے ایک کمیٹی بھی بنائی گئی۔ اس زمانے میں ترقی پسند ادیبوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سے فاشزم کی مخالفت میں ایک بیان حاصل کیا اور اُسے اخبارات میں شائع کرایا۔

اسی طرح ہری پورہ کے جلسے میں صدارت کرتے ہوئے بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے ترقی پسند ادب کی حمایت میں ایک تقریر کی۔ اس زمانے میں یہاں آل انڈیا کانگرس کا جلسہ بھی منعقد ہوا تھا، جس کی وجہ سے بہت سے سیاستداں، صحافی اور ادیب بھی اس جلسے میں موجود تھے۔

ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن وہ عین وقت پر بیمار ہونے کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ لیکن انھوں نے اپنا خطبہ لکھ کر بھیج دیا تھا۔ جو ملک راج آنند کی صدارت میں پڑھا گیا۔ اس کانفرنس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب و شاعر مانک بنرجی، تاراشنکر بنرجی، بدھیا دیو بوس، پرماتما چودھری، جے۔ این ۔سین گپتا اور سدھیندر ناتھ دت وغیرہ شریک ہوئے۔ اردو کے ادیبوں میں احمد علی، سجاد ظہیر، عبدالحلیم، کرشن چندر، مجازؔ اور علی سردار جعفری وغیرہ شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالحلیم

نے اپنا مقالہ پڑھا اور پھر اس کے بعد اردو، بنگالی، گجراتی، مراٹھی اور تامل ادب کے رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالحلیم کو کانفرنس کا جنرل سیکٹری بھی چنا گیا۔جیسے جیسے وقت بدلتا گیا ترقی پسند مصنفین کی اس تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ قابلِ تعریف تھی۔ٹیگور اور اقبالؔ، پریم چند اور مولی عبدالحق، جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو، آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائین جیسے عالموں، ادیبوں اور سیاست دانوں نے اس تحریک کے مقاصد کو لبیک کہا اور ہمت افزائی کی۔ ہر ایک ادیب نے اس رجحان سے متاثر ہو کر اپنی تحریروں میں نیا شعور اور نیا احساس پیدا کیا اور پہلی بار بنگالی زبان کے مشہور ماہنامہ ''پرچئے'' نے اپنی زبان کے ادیبوں کی نظمیں اور مضامین کو خاص طور پر جگہ دینی شروع کی۔ان کے علاوہ حیات اللہ انصاری نے کانگریس کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار ''ہندوستان'' لکھنؤ سے جاری کیا۔اس کانفرنس میں ترقی پسند ادیبوں کی روئداد اور تقریریں اور شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات بھی شائع ہونے لگیں۔اس کے بعد حیدر آباد سے سبط حسن نے ہفتہ وار اخبار ''پرچم'' نکالا۔لیکن کچھ ہی دنوں بعد ترقی پسند ادیبوں کا اپنا رسالہ ''نیا ادب'' کے نام سے جاری ہوا۔اس رسالے کا پہلا پرچہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

اس کے پہلے شمار میں شامل مضامین میں ڈاکٹر ملک راج آنند کا مضمون ''ایرانی تھیٹر'' احمد اکبر آبادی کا ''ادب اور زمانے کا تقاضا'' اور علی سردار جعفری کا مضمون '' ترقی پسند تحریک'' قابلِ ذکر ہیں۔کہانیوں میں مخدم محی الدین '' آدم کی اولاد'' اور اختشام حسین کی ''کھنڈر'' وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔نظموں میں مجاز، جذبی، جانثار اختر اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ کی نظمیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ عابد گلزار کا ڈراما ''ڈاکٹر'' اور پریم چند کے خطبہ صدارت کا ایک حصہ بھی ''ادب اور زوق حسن'' کے نام سے شائع ہوا۔

''نیا ادب'' کے پہلے شمارے میں ترقی پسند نوجوانوں کے مضامین اور نظموں کے علاوہ شاعروں کے شعر خالی جگہوں پر لکھوائے گئے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہیں بہشت بھی ہے حورو جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں
(اقبالؔ)

زرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہن عالم سخت نا ہموار ہے ساقی
(جوشؔ)

اس انجمن دہر کا ہر تازہ تغیر
میرے لیے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں
(جگرؔ)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہو زندگی دشوار ہو جائے
(اصغرؔ)

بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہِ واپسیں
چلی دل کی وادیوں سے آندھیاں لیے ہوئے
(فانیؔ)

''نیا ادب'' کا دوسرا شمار مئی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں جوشؔ کی نظم اور عصمت چغتائی کا افسانہ ''گیندہ'' کے علاوہ ''جدید چینی ادب'' پر سوامی اددتیانند کے مضمون کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ نیا ادب کے اداریے میں ''نئی شاعری میں حُسن وعشق'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے جگرؔ مراد

آبادی کی غزل کے دوشعر بطور مثال پیش کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ ہمارے پرانے غزل گو آج کل کے حالات سے کس طرح متاثر ہورہے ہیں۔جگرؔ کے وہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہی شورش ہے لیکن جیسے موجِ تہ نشیں کوئی

وہی دل ہے مگر آواز مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانہ وساقی وہی شیشہ وہی صہبا

مگر آواز نو شا نوش مدھم ہوتی جاتی ہے

اس کے علاوہ انگلستان کے سائنسداں پروفیسر ہالڈین کے مضمون ''سائنس اور زندگی'' کا ترجمہ سعید احمد نے کیا۔گورکی کی کہانی ''وہ لڑکا'' کا ترجمہ مجازؔ نے کیا جسے اس شمارے میں جگہ دی گی ان کے علاوہ شفیق نقوی کا مضمون ''انسان کی قیمت'' بھی اس شمارے میں شامل تھا۔

تیسرا شمارجون ۱۹۳۹ء میں ہوا۔اس میں اداریہ ''ادب اور سیاست'' پر تھا۔سبط حسن کا مضمون ترکی کے انقلابی شاعر ''ناظم حکمت'' پر تھا۔علی عباس حسینی کی کہانی '' آم کا پھل'' اور محمود الظفر کا ڈراما'' امیر کا محل'' اس کے علاوہ رشید جہاں نے سین ڈورگرگ کی کہانی ''ایک واقعہ'' کا ترجمہ بھی کیا جسے اس شمارے میں شامل کیا گیا تھا۔

ان تینوں شماروں کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا کہ یہ چیزیں ترقی پسند ادب کے لیے اولین نقوش کی حیثیت رکھتی ہیں۔'' نیا ادب'' نے اپنی ابتدائی زندگی میں اُس دور کے ادیبوں کے مضامین ، افسانوں،نظموں اور حالات زندگی کو بھی ان شماروں میں شائع کیا تھا۔خلیل الرحمٰن اعظمی اس حوالے سے اپنی کتاب ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر چہ اس شمارہ میں ترقی پسند ادیبوں کی بہت سی چیزیں شامل نہ ہوسکیں۔مگر

ان رجحانات کی جونمائندگی کر رہے تھے۔مثلاً رشید جہاں، حیات اللہ انصاری، اور
اختر انصاری وغیرہ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے مجموعے حال ہی میں شائع ہو
چکے تھے۔اوراس کا اداریے میں ذکر کیا گیا تھا۔'' ۱۰؎

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت بھی بڑھنے لگی اور یہ ''نیا ادب'' ترقی پسند مصنفین کے مقاصد کا ترجمان بنا۔اور تین ماہ کے اندر سجاد ظہیر کی کتاب ''لندن کی ایک رات'' حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' مجآز کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' اور سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' شائع کیا گیا۔

چند روز بعد جوشؔ نے اپنا رسالہ ''کلیم'' دہلی سے نکالا۔جو ترقی پسند مقاصد کا ترجمان تھا، جسے بند کر کے وہ لکھنؤ میں مقیم ہوگئے۔اور وہاں ''نیا ادب'' میں شامل ہوکر انھوں نے اپنے رسالے کو ''نیا ادب'' میں ضم کر کے اس کا نام ''نیا ادب کلیم'' رکھ دیا۔

اردو میں ''نیا ادب'' ترقی پسند مصنفین کے مقاصد کی اشاعت کرتا تھا۔کلکتہ میں ترقی پسند کانفرنس میں ایک انگریزی ماہنامہ ''انڈین لٹریچر'' کی اسکیم بھی منظور کی گئی۔اس رسالے کی ادارت کرنے والوں میں ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالحلیم اور احمد علی تھے۔اس کے پہلے شمار میں ڈاکٹر عبدالحلیم کا مضمون ''ہندوستانی'' پروفیسر ڈی پی مکر جی کا ''ہندوستانی مصوری'' پر سیندرھرت کا ''بنگالی ادب'' اور نارومنی کا ''ترقی پسند قلم'' جیسے عنوانات کے تحت شائع ہوئے۔اس کے علاوہ پریم چند کی کہانی ''کفن'' کا ترجمہ احمد علی نے کیا اور ملک راج آنند نے صدارتی تقریر کی۔اس طرح ہندوستان میں بہت ساری جگہوں سے رسالے شائع ہونے لگے جس سے ترقی پسند ادب کو خوب فروغ ملا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں حلقۂ ادب لکھنؤ کے تحت ''آزادی کی نظمیں'' جنہیں سبط حسن نے مرتب کر

کے شائع کیا۔جس میں غالب سے لے کر موجودہ دور کے شعرا کی وہ تمام نظمیں شامل تھیں جن میں وطن کی آزادی اور قومی بیداری کے گیت گائے گئے تھے۔لیکن ان مجموعوں کو سرکار نے جلد ہی ضبط کر لیا اور اس کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا۔

ترقی پسند انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی ۱۹۴۲ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ڈاکٹر عبدالحلیم نے اس کی صدارت کی۔ یہ وہ دور تھا جب دوسری جنگ عظیم کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے اور بین الاقوامی سیاسی حالات نازک صورت اختیار کر چکے تھے۔اس سلسلے میں ترقی پسند ادیبوں کی شروع سے ہی ایک پالیسی تھی کہ وہ پہلے بھی فاشزم کے خلاف اور جمہوری حقوق کی حمایت میں آواز اُٹھا چکے تھے۔لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں وہ ادیب بھی شامل تھے جو ادبی نظریات میں ترقی پسند تحریک سے متفق نہیں تھے۔خاص طور پر حلقہ ارباب ذوق کا گروہ جو ادب کی افادیت سے منکر تھا۔جو ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپگنڈہ کہتا تھا۔اس جماعت کے اکثر ادیب فرانس اور انگلستان کے اشاریت پسندوں اور ہیت پرستوں سے متاثر تھے اور فرئڈ کے نظریے کو اپنی شاعری اور افسانہ نگاری میں برت رہے تھے۔

اس اجلاس میں ایک طرف سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحلیم، کرشن چندر، سردار جعفری، مجازؔ، رشید جہاں، اور سبط حسن کا گروہ شریک تھا۔اور دوسری طرف راشدؔ، میراںؔ جی، مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا'' اور قیوم نظر کے علاوہ مولانا عبدالمجید، سالکؔ اور حافظ جالندھری بھی شریک تھے۔ یہ اجلاس ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں ہوا، جہاں ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی گئی، جس میں ادیبوں اور فنکاروں نے یہ اعلان کیا کہ وہ اتحادی اقوام کے ساتھ اور فاشزم کے خلاف ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو بین الاقوامی سیاست میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اس حوالے سے سجاد ظہیر (روشنائی) میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہر آزادی خواہ کے سامنے جو بین الاقوامی حالت کو تھوڑا سا بھی سمجھتا تھا یہ سوال اُٹھ کھڑا ہوا کہ اگر ہٹلر فاشزم کو اس جنگ میں کامیابی ہوگئی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فاشست سامراج ساری دنیا پر حاوی ہو جائے گا۔ دنیا کے سارے محکوم اور بھی زیادہ سختی سے کچلے جائیں گے اور غلام بنائے جائیں گے اور اگر سوویت یونین (SouthUnion) کی فتح ہو تو اس کی مدد سے انقلابی مزدور تحریک اور تمام دنیا کے محکوم ممالک کی آزادی کی تحریکیں مضبوط ہوں گی امریکی اور برطانوی سامراج بھی باقی رہیں گے پھر بھی مجموعی حیثیت سے دنیا کی عوامی قوتوں میں بہت اضافہ ہوگا اور خود ہمارے اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔'' [۱۱]

سجاد ظہیر کی تحریروں کے علاوہ جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی نے جنگ کے متعلق دہلی میں جو پالیسی بنائی تھی کہ اس حمایت میں جو بیانات اس وقت کے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ جوشؔ اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> ''ہمارا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ ہماری زندگی فنِ شعر اور علم وادب سے وابستگی رکھتی ہے۔ لیکن باوجود تخلیقی وتعمیری جدوجہد کے ہمارا ایک سیاسی عقیدہ ہے جسے ہم شاعر وادیب اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی کامل آزادی اور سوشلسٹ نظام حکومت ہمارا انتہائے خیال ہے۔ ایک طرف ضمیر کے تقاضات ہیں، دوسری طرف بین الاقوامی حالات اس قدر تشویش ناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں کہ کوئی باہوش اور حساس انسان خاموش

نہیں رہ سکتا۔ان حالات میں کوئی متمدن اور مذہب انسان غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان بطور خاص اس وقت نہایت عظیم خطرات میں گھرا ہوا ہے۔غیر ملکی وحشی جنھوں نے چین میں تہذیب سوز مظالم کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے ہمارے ملک کو لوٹنے کے لیے ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ایسی حالت میں ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کرے۔'' ۱۲؎

ترقی پسند شاعر مجاؔز نے اسی دور میں اپنا ایک بیان اخبارات میں شائع کرایا اور اس موضوع پر ایک نظم لکھی جس کا نام ''آہنگ'' تھا۔اخبارات میں شائع ہونے والا مجاؔز کا بیان یہ تھا کہ:

''میں تو ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے،ایک رہنما کی حیثیت سے نہیں صرف ایک مسافر کی حیثیت سے اپنے شاعروں اور ادیبوں کی صورت حال کی نزاکت بتا دینا چاہتا ہوں۔اگر یہ حقیقت ہے؟ کہ قومی تخریب وتعمیر میں شاعروں اور ادیبوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے تو یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اس نازک دور میں ہر ادبی اقدام بڑی ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے۔ہمارے نغموں کو آج دوبارہ وطن کی فضاؤں میں گونجنا چاہیے تا کہ اتحاد خود اعتمادی،سرفروشی اور حریت کے جذبات سے معمور ہو کر ہم اپنے راستے سے ہر اس رکاوٹ کو ہٹا دیں جو اندھے سامراجی ہماری راہ میں حائل کرتے ہیں اور تمام دنیا عوام کے ساتھ مل کر اس جنگ آزادی میں اس طرح شریک ہوں جو ہماری عظیم المرتبت قوم کے شایانِ شان ہیں۔'' ۱۳؎

مجاؔز کے علاوہ مخدوؔم کا ترانہ ''یہ جنگ ہے جنگ آزادی'' اور نظموں میں ''اندھیرا'' اور ''سپاہی''

اُس دور کی یادگار نظمیں ہیں۔ جو ترقی پسند تحریک کی ترجمانی کرتی ہیں اور افسانوں میں کرشن چندر کا افسانہ ''موبی'' اور ''ایک نافسطائی کی ڈائری''۔ ڈراموں میں خواجہ احمد عباس کا ''یہ امرت ہے'' سردار جعفری کا ڈراما ''یہ کس کا خون ہے'' ترقی پسند موضوعات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جب ترقی پسند ادب کی تحریک کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے بانیوں نے اپنے اعلان ناموں اور خطبوں میں جن مقاصد کا اظہار کیا تھا اُسے ہمارے ملک کے تمام سنجیدہ لوگوں نے قبول کیا اور نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی کی۔ چار پانچ سال میں نئے نوجوان ادیبوں کے جس قسم کے افسانے اور نظمیں شائع ہوئیں، انھیں دیکھ کر ترقی پسند ادب کے متعلق علمی اور ادبی حلقوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلنے لگیں۔ کیوں کہ اس وقت پریم چند کا خطبہ اور ترقی پسند تحریک کا وہ اعلان نامہ جن میں ترقی پسندی کا تصور پیش کیا گیا تھا وہ بعض ادیبوں کی نظر سے نہیں گزرے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت ترقی پسند ادب میں بیک وقت کئی میلانات تھے۔ ان میں کچھ لوگ افادی اور مقصدی ادب کے علمبردار تھے تو کچھ ایسے بھی تھے جو انگلستان اور فرانس کی جدید ادبی تحریکوں سے متاثر تھے۔ جن کی وجہ سے افسانوں میں تحلیل نفسی اور لاشعوری کیفیات کا رجحان اور شاعری میں ابہام، اشاریت اور نئی ہیت کی تلاش کا رجحان بھی پرورش پا رہا تھا۔ ان حضرات نے مغرب کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے اپنے نظریات کو مضامین اور دیباچوں میں پیش کیا تھا۔ ان میں ن۔م۔ راشدؔ، میراں جیؔ، محمد حسن عسکری اور ممتاز مفتی کو اس جدید ادب سے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس گروہ کے ادیبوں کے یہاں بعض باتیں قابلِ قدر تھیں اس لیے بعض ترقی پسند نقاد بھی اپنے مضامین میں ان کا نام لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کے یہاں دونوں رجحانات ملتے تھے، مثلاً سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ۔ اس طرح ان تمام باتوں سے اس وقت کے ذہن کی پیداوار کو ترقی پسند ادب کا نام دیا جانے لگا اور

ترقی پسند ایک مبہم اصطلاح بن گئی۔

ترقی پسند ادب کی اس تحریک پر زیادہ تر حملے سرکاری حلقوں نے کیے، کیوں کہ ترقی پسند ادیبوں کا بنیادی مقصد اپنے سیاسی رجحانات، برطانوی سامراج کی مخالفت اور ایک نئی جمہوریت کے نظام کا پرچار کرنا تھا۔کلکتہ سے ایک اخبار ''اسٹیٹس مین'' نے اپنے اداریے میں اس تحریک کو خطرناک بتایا تھا اور اس پر سخت نکتہ چینی کی تھی لیکن ۱۹۴۲ء میں دہلی کی کانفرنس میں ترقی پسند ادیبوں نے دوسری جنگ عظیم میں اتحادی طاقتوں سے تعاون کی پالیسی بنائی تھی۔اس کے بعد بعض ایسے حضرات نے بھی ترقی پسندی کو مشتبہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا، جن کی عملی حیثیت اور تنقیدی شعور کا ادبی حلقوں میں احترام کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں پہلا مضمون آثر لکھنوی کا تھا۔اس مضمون کا نام ''نیا ادب کدھر جا رہا ہے'' جسے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے رسالے میں شایع کیا۔اس مضمون میں آثر صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''ضرورت اصلاح کی ہے نہ کہ ایسے انقلاب کی جو موجودہ نظام کو بدل کر امیر کو غریب یا نیست و نابود کر کے غریب کو امیر بنا دے۔یاد رکھیے کہ ان خیالات کے تابع یہ غریب امیر بن کر ایسے گُل کھلائیں گے کہ موجودہ خوش حال طبقے کے بھی کان کاٹیں گے۔'' [۱۴]

سجاد ظہیر نے بڑی تفصیل سے آثر لکھنوی کے اس نظریے کا جواب دیا کہ اصلاح کے مقابلے میں انقلاب کی کیوں ضرورت ہے۔جہاں تک شاعری کی فنی و جمالیاتی خصوصیات کا تعلق ہے اس حوالے سے سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ:

> ''ظاہر ہے شاعری کا تعلق بالخصوص انسان کے جذبات سے ہے۔شاعری کا مقصد جذبات کے ذریعے اثر ڈال کر دماغ کو ایک خاص سمت رجوع کرنا

ہے۔اس مقصد میں کامیابی اس کے لیے اور اس کے کلام کے سامعین اور
ناظرین دونوں کے لیے باعثِ مسرت بھی ہوتی ہے اور وہ خیالات جس کے
ماتحت اس نے شاعری کی ہے ہمارے دل و دماغ میں پیوست بھی ہوتے
ہیں۔'' ۱۵

اس کے علاوہ راشید احمد صدیقی نے بھی اس زمانے مضامین لکھے۔جس میں انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کو پیش کیا کہ شعر و ادب کا مقصد قوم و جماعت کی فکر و نظر کے مطالبات کو پورا کرنا ہے۔چناچہ وہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شعر و ادب قوم و جماعت کی فکر و نظر کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا تو
اس شعر و ادب کو جوں کا توں رہنے دینا کبھی کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔'' ۱۶

رشید احمد صدیقی نے اپنے اس مضمون کے اختتام میں پُرانے ادب کو ماننے والوں کو بھی اپنی تنقید کی زد میں رکھا اور کہا کہ:

''میں سمجھتا ہوں کے پرانے ادب کے پیروں کو بھی دنیا کے موجودہ مسائل اور
مطلب کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھنا اور ان کا حل پیش کرنا چاہیے، جیسا کہ
بھلا یا برا نئے ادب والے کرتے ہیں۔اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو ان کو اس کا
بالکل حق نہیں پہنچتا کہ وہ ترقی پسند ادب کو ہدف ملامت بنائیں۔زہریلی گیس
سے مقابلہ اب ممنوع ہو گیا ہے۔'' ۱۷

رشید احمد صدیقی کے اس مضمون نے ترقی پسند ادب میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، جس سے ترقی پسند نقاد ''نیا ادب'' اور ''ترقی پسند ادب'' کو الگ الگ نظریے دیکھنے لگے اور اس کے خلاف کھل کر

بات کرنے لگے اور ان سے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند عناصر کی تمیز کرنے لگے۔

رشید احمد صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر عبدالحلیم نے مضامین لکھ کر ترقی پسند ادب میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اعتراضات اور بحثوں نے ترقی پسند تحریک کو مجموعی طور پر فائدہ پہنچایا۔ جس سے ترقی پسند ادیبوں کا ذہن صاف ہوا اور انہوں نے اس مفہوم کو صحیح طور پر سمجھا۔

بنگال میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء بہت ہی دردناک واقع پیش آیا۔ جس کی مثال پورے ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس وقت کوئی حساس اور انسان دوست ایسا نہ تھا جس کے ذہن کو اس واقع نے جھنجھوڑ کر نہ رکھ دیا ہو۔ اخباروں میں ہلاک ہونے والوں کی تصویریں دیکھ کر لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے اکثر ادیبوں کو اس واقعے نے بے حد متاثر کیا ۔اس کے خلاف ترقی پسند ادیبوں نے اپنے افسانوں اور مضامین کے ذریعے احتجاج کیا۔

افسانوں میں کرشن چندر کا افسانہ ’’ان داتا‘‘ خواجہ احمد عباس کی کہانی ’’ایک پائیلی چاول‘‘ اور دیوندر ستیارتھی کا افسانہ ’’نئے دھان سے پہلے‘‘ میں ان مسائل کی عکاسی ملتی ہیں۔ اور اس موضوع پر لکھی گئی نظموں میں اختر الایمان کی نظم ’’ایک سوال‘‘ اور اختر انصاری کی نظم ’’کلکتہ‘‘ اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ علی سردار جعفریؔ اور مخدومؔ وغیرہ نے بھی اس موضوع پر نظمیں لکھیں۔ گیتوں میں دامنؔ جونپوری کا گیت ’’بھوکا ہے بنگال‘‘ اور سید مطلبی فریدہ آبادی کا گیت ’’تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے، دھرتی ماں چھاتی سے لگالے‘‘ ایسی تخلیقات ہیں جن میں اس کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ سبط حسن نے ایک مضمون ’’زندگی کی نقش گری‘‘ لکھا۔ خواجہ احمد عباس نے ’’دھرتی کے لال‘‘ کے نام سے ایک فلم بھی بنائی جو اس موضوع پر کامیاب ترین اور موثر فلم ہے۔ نہ صرف ترقی پسند ادب بلکہ جگر مرادآبادی جن کی شاعری

اکثر و بیشتر حسن و عشق کے موضوعات پر ہوتی تھی انہوں نے بھی ایک نظم ''بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں''، لکھی۔ جو بعد میں ''نیا ادب'' میں شائع بھی ہوئی۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے نہ صرف ان حالات کو بلکہ ملک کے بیشتر حالات کو موضوع بنا کر ترقی پسند ادب کی پیروی کی۔

اسی کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالحلیم نے ادب میں فحاشی کے خلاف ایک قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ اردو ادب میں اس وقت جو رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں، ان کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند نظریے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک کے بیشتر مخالفین منٹو اور میراں جی کی چند تخلیقات کو بنیاد بنا کر تحریک کو بدنام کر رہے تھے اور بعض ترقی پسند نوجوان ان سے متاثر ہو کر فحش نگاری کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس تجویز کی قاضی عبدالغفار نے کھل کر مخالفت کی اور کہا کہ:

> ''ہمیں اس قسم کی کوئی تجویز پاس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ کسی قسم کی سخت انتساب کی ضرورت ہے۔ جنسی موضوعات پر بھی ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے بیشتر لکھنے والوں کا زاویہ نگاہ تعمیری اور ترقی پسندانہ ہو۔ جنس بھی سماج کے اہم مسائل میں سے ہے۔ اس تجویز سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ ترقی پسند نوجوان اس موضوع اور زندگی کے اس پہلو کو خارج سمجھ کر اس سے قطع تعلق کر لیں۔''
>
> ۱۸

قاضی عبدالغفار صاحب کی اس قرارداد کے بعد اس قرارداد کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ:

> ''ادب میں لطیف اور حسن کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں۔'' ۹

مولانا حسرت موہانی کی اس آخری تقریر کے ساتھ ہی یہ قرارداد مسترد ہوگئی۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں لکھنؤ میں ہوئی۔اس کانفرنس کے آغاز کے لیے مولانا آزاد کو مدعو کیا گیا۔لیکن وہ عین وقت پر نہ آسکے جس کی وجہ سے آغاز کی رسم ڈاکٹر سید محمود نے ادا کی۔اس کانفرنس میں زیادہ تر اردو ہی کے قلم کاروں نے شرکت کی جن میں مولانا حسرتؔ موہانی، نیاز فتح پوری، جگر مرادآبادی، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، خواجہ احمد فاروقی، قاضی عبدالغفار، عبادت بریلوی، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالحلیم، سردار جعفری، احتشام حسین، ہنس راج ، ڈاکٹر زین العابدین، ڈاکٹر محمد اشرف، مجازؔ، جذبیؔ، صہبا لکھنوی، روشن صدیقی اور سلیمان اریب وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ترقی پسند مصنفین پر یہ الزام تھا کہ ان میں کمیونسٹوں کا عمل وجود پا رہا ہے اور یہ انجمن ترقی پسند ادب سے قطع تعلق کر کے اپنا ناطہ سیاست سے جوڑ رہی ہے۔اس کے بعد انجمن کا ایک تنظیمی جلسہ بھی ہوا، جس میں یہ کہا گیا کہ اس کا ایک مرکزی دفتر بمبئی میں قائم کیا جائے اور سردار جعفری کو اس کا جنرل سیکٹری بنایا جائے۔ترقی پسند انجمن کی اس پانچویں کل ہند کانفرنس کی مکمل روئداد اور اس میں پڑھے جانے والے مضامین اور نظم ونثر وغیرہ کو جمع کر کے صہباؔ لکھنوی نے افکار (بھوپال) کا ایک خاص نمبر شائع کیا۔

ملک تقسیم ہونے کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں فسادات کا جس طرح ماحول پیدا ہو گیا تھا۔اس ماحول سے انسانیت اخوات اور اعلیٰ اقدار کی طرف سے بے یقینی پیدا ہو رہی تھی جو کہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک دردناک المیہ تھا۔اس طرح فسادات کی وجہ سے بہت سے ذہن منتشر ہوئے بلکہ افسانہ نگار بھی اس سیلاب میں بہہ گئے تھے۔پاکستان میں سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری نے اپنی تحریروں سے منفی رجحانات کو ہوا دی اور حقیقت نگاری کے علاوہ نفسیاتی تحلیل کے نام پر انسانی فضلیت اور

بنیادی سچائی سے ہی انکار کرنے لگے، یہی وجہ تھی کہ اس موضوع پر کرشن چندر کے افسانے جو'' ہم وحشی ہیں'' کے نام سے ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے۔ جو جذباتیت اور ہیجان کی عکاسی کرتے ہیں۔ پھر بھی کرشن چندر کی انسان دوستی کے جذبے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر کئی افسانے لکھے گئے۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ'' لاجونتی''عصمت چغتائی کا'' جڑیں'' حیات اللہ انصاری کا'' شکر گزار آنکھیں'' اور ناولٹ'' ماں بیٹا'' خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سچائی اور انسانیت کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کے علاوہ فسادات کے موضوع پر دیگر تخلیقات بھی ملتی ہیں۔ مثلاً فکر تونسوی کا رپوتاژ'' چھٹا دریا'' اور رامانند ساگر کا ناول'' اور انسان مر گیا'' اور خواجہ احمد عباس کا افسانہ'' سردار جی'' بھی شامل ہے۔ خواجہ احمد عباس کے اس افسانے پر بعض غلط فہمیوں کی بنا پر حکومت نے مقدمہ بھی چلایا، حالانکہ یہ افسانہ ایک صحت مند نقطہ نظر سے لکھا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے ان حالات سے متاثر ہو کر اپنا قلم اٹھایا۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں کے سامنے سب سے بڑا مسلہ زبان کا تھا۔ اس مسلے پر بہت ساری تقریریں اور بحثیں بھی ہوئیں اور ایک تنظیمی جلسہ بھی طلب کیا گیا۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں یو پی کے ادیبوں نے ایک صوبائی کانفرنس منعقد کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ہندی کا جھگڑا سب سے زیادہ شمالی ہندوستان یعنی یو پی کے ادیبوں کو اُلجھن میں ڈال رہا تھا اور ان کا مقصد تھا کہ اس باب میں ترقی پسند تحریک کی پالیسی واضح کر دی جائے۔ اس کانفرنس میں اردو کے ادیبوں میں ڈاکٹر عبدالحلیم، آل احمد سرور، احتشام حسین، ممتاز حسین، مجازؔ، مجروحؔ سلطان پوری اور ساحر لدھیانوی موجود تھے۔ ہندی کے ادیبوں میں رام بلاس شرما، پرکاش چندر گپت، نروتم ناگر ایڈیٹر'' نیا ساہتیہ'' اور شیل وغیرہ تھے۔ اس کانفرنس میں ایک منشور بھی پیش کیا گیا جن میں ترقی پسند ادیبوں کے فرائض اور نئے حالات پر روشنی ڈالی گئی۔

ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کل ہند کانفرنس ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کو بمبئی کے ایک علاقہ بھیمڑی میں منعقد کی گئی جس کی صدارات ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر رام بلاس شرمانے کی۔ اس کانفرنس کی سب سے اہم اور یادگار چیز انجمن کا وہ نیا اعلان نامہ ہے جو اس کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔ اس اعلان نامے کا مقصد تھا کہ ۱۹۳۶ء کا اعلان نامہ موجودہ حالات میں کچھ کمیوں کا احساس دلا رہا ہے، اس لیے نئے اعلان نامے کی ضرورت کو محسوس کر کے اسے زیادہ سے زیادہ حسب حال اور جامع بنانے کی کوشش کی گئی اور کہا گیا کہ ترقی پسند قلم کاروں کو علی الاعلان ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دینے اور رجعت پرستی سے کنارہ کشی اختیار کر لینے کی ہدیت دی گئی۔ اس کانفرنس کا ''نیا اعلان نامہ'' کچھ اس طرح تھا:

> ''آج ہندوستانی ادب میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آج ترقی پسند اور رجعت پسند رجحانات بہت زیادہ صفائی کے ساتھ ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کش مکش میں اس جدوجہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ہندوستان کی جنتا جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے کر رہی ہے۔'' ۲۰

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی عوامی جدوجہد نے ایک نیا رخ بدلا۔۔ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ قومی تحریک کے زمانے میں بھی سامراج سے سمجھوتا کرنے کی کوشش میں برابر لگا ہوا تھا۔ اب کھلم کھلا اس کا ساجھی اور دوست بن گیا۔ اس سمجھوتے کی سب سے بڑی مثال یہ تھی کہ ہندوستان کی حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہندوستانی عوام کی مرضی کے خلاف تھا، اس لیے کہ ہندوستان کی عوام ایک آزاد اور خود مختار عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہتی ہے۔ پچھلی لڑائی ختم ہوئے ابھی بہت دن نہیں ہوئے کہ ایک دفعہ فاشزم کو شکست دینے کے بعد پھر دنیا کی عوام کو تیسری عالمگیر لڑائی کی نئی مجنونانہ تیاری میں لگایا جا رہا تھا اور ہندوستان کی عوام کو بھی اس پھندے

میں ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ پچھلی لڑائی میں جمہوری طاقتوں نے سوویت یونین کی رہنمائی میں فاشزم کے خلاف جو فتح حاصل کی تھی اس کی وجہ سے امن جمہوریت اور اشتراکیت کی تحریکوں نے بہت زور پکڑا تھا لیکن برطانوی اور امریکی سرمایہ دار جو اپنے منافع کو نہ صرف قائم کرنا بلکہ بڑھانا چاہتے تھے۔اس بات کی سازش کر رہے تھے کہ ڈالر اور ایٹم بم کے ذریعہ دنیا کو غلام بنایا جائے۔عوام کا معیار زندگی گرتا جارہا تھا اس کے ساتھ ساتھ حیوانی لوٹ مار کے خلاف جنتا کی لڑائی بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ ان حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے سرمایہ دار ملکوں کا گمراطبقہ ایک نئی لڑائی کی فضا تیار کر رہا تھا۔سودیت یونین، پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کی عوام کی جدوجہد کے بارے میں تہمتیں تراش کر اور جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں کے دماغوں کو لڑائی کے لیے آمادہ کیا جارہا تھا۔سامراجی طاقتیں ملایا اور برما کے عوام کو دبانے کے لیے پوری بربریت سے کام لے رہی تھیں اور مداخلت کر کے وہاں کی عوام کو آزادی حاصل کرنے سے باز رکھنا چاہتی تھیں۔اُن دنوں ہزاروں آدمی جن میں مزدور، کسان، ادیب اور فنکار سبھی شامل تھے ہندوستانی قید خانوں میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ان لوگوں کو قید کرنے سے پہلے رسمی طور پر عدالت کے سامنے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔کانگریسی حکومتیں ایک طرف لوٹ مار کرنے والے طبقے کے مفاد کی حفاظت کرتی رہیں۔ برطانوی اور امریکی سامراج کے ساتھ مل کر ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کے خلاف فوجی مرکز بنانے اور کامن ویلتھ کی زنجیروں کو مضبوط کرنے میں مدد دیتی رہیں۔عوام کی شہری آزادی اور ان کے جمہوری حقوق کو سلب بھی کیا گیا۔مزدوروں ،کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش بھی جاری رہیں اور دوسری طرف تہذیب و تمدن اور ادب کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرتی ہیں جو جرمنی اور اٹلی میں فاشتوں نے اختیار کیا۔مثلاً سودیت یونین کی فلموں پر پابندی لگائی گیئں۔خود ہندوستان میں ترقی پسند فلموں کے بنانے میں طرح

طرح کی رکاوٹیں بھی ڈالی گئیں لیکن امریکہ اور دوسرے پچھمی ملکوں سے آنے والی سڑی گلی غیر جمہوری فلموں کو دکھانے کی پوری آزادی دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے پاسپورٹ چھین لیے گئے اور ترقی پسند ملکوں سے تہذیبی اور سماجی تعلقات قائم کرنے کی ہرکوشش کو روکا گیا۔ جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کیا گیا لیکن بدیسی ایجنسیوں اور ہندستانی اجارہ داروں کو پوری آزادی تھی کہ وہ سب کو اپنے جال میں پھنسائے رکھیں اور غیر جمہوری پروپگنڈہ کرتے رہیں۔ اس پر ترقی پسند ادیبوں کا مقصد تھا کہ ادب کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور عوام کے ساتھ مل کر جدوجہد کی جائے۔ جو اس اقتباس سے ملاظہ ہو:

> ''ان حالات میں ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اظہار خیال کے لیے جدوجہد کریں، جمہوری رسالوں اور اخباروں کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کریں اور عوام کے ساتھ مل کر معیار زندگی کو بڑھانے اور تعلیم، تہذیب اور تمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیں۔'' ۲۱

ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے بھیمڑی میں جو نیا منشور پیش کیا تھا، اس سے تحریک کو فائدہ تو نہیں ملا بلکہ ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کے نتائج ترقی پسند ادیبوں کی اس تحریک اور ادبی تخلیقات کی پیدوار دونوں کے حق میں غیر ضروری ثابت ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نئے اعلان نامے کے تقاضے ادب کے تقاضوں پر غالب ہوگئے، اس ادب کو دیکھ کر چند اور سنجیدہ قلم کاروں نے موضوعاتی اور سطحی ادب تخلیق کرنے پر خاموش رہنے کو ترجیح دیا۔ جس سے ادب میں بےعملی کی سی کیفیت نمایاں ہوگئی۔ اس حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ:

> ''کچھ ہی دنوں کے بعد ترقی پسند تحریک کے ترجمان ''شاہراہ'' کا تنزل شروع

ہوگیا۔ترقی پسندوں میں'' ادبی جمود ''پر بحث ہونے لگی۔ عصمت
چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور مخدوم محی الدین کے کھلی چٹھیاں ادیبوں کے دستخط
کے ساتھ شائع کی جانے لگیں کہ'' آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا''۔شاہراء کو
جاری رکھنے کی اپیل شائع ہونے لگی اور بعض خریداروں کے خطوط کہ'' شاہراہ
بند نہیں ہوگا۔'' ۲۲؎

نئے منشور کو پیش کرنے کے بعد صورت حال بدلنے لگی اور ترقی پسند مصنفین کی ساتویں کل ہند کانفرنس مارچ ۱۹۵۳ء کو دہلی میں کرشن چندر کی صدارت میں طلب کی گئی۔اس کانفرنس میں دل کھول کر بحثیں ہوئیں اور ایک نیا منشور ایک بار پھر سے منظور کیا گیا۔اس منشور میں دہشت پسندی، عریانی، فحاشی اور غارت گری پھیلانے والے ادب کی جم کر مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ہندوستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا ادب اور آرٹ، ان کی قومی روایت
کے مطابق ترقی کرے۔ تمام وطن دوست ادیب اور فن کار عوام کے اس
جائز اور صحیح تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اپنی کاوشوں کے ذریعے
ہر اس چیز کو ترقی دینا چاہتے ہیں، جو ہمارے تہذیبی ورثے میں خوبصورت اور
شاندار ہے اور وہ چیز جو فرسودہ، بے جان اور زوال پذیر ہے اسے ختم کر دینا
چاہتے ہیں۔'' ۲۳؎

اس کانفرنس نے ترقی پسند ادب کی تخلیق سے متعلق بہت سے ترقی پسندوں ذہنوں میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جو بھیمڑی میں طلب ہوئی کانفرنس کا نتیجہ تھا۔اس کے علاوہ ادبی جمود کے موضوع پر ہونے والی بحثیں بھی سرد پڑھنے لگیں۔دہلی کانفرنس کے ایک سال بعد یعنی مارچ ۱۹۵۴ء میں

علی گڑھ کے ادیبوں نے ایک سالانہ جلسہ کیا۔ جس میں قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالحلیم، کرشن چندر، اسلوب احمد انصاری، معین حسن جذبی اور غلام ربانی تاباں وغیرہ شامل تھے۔ اس جلسے میں سب سے اہم تقریریں، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقیاور ڈاکٹر عبدالحلیم کی تھیں۔ قاضی عبدالغفار نے بھی اپنی تقریر میں کہا کہ:

''ترقی پسند ادیب ارتقاء پذیر حلقوں سے ادبی تحریکوں کی صورت میں ہمارے ادب کو گھن لگا رہے ہیں۔'' ۲۴

اس کے بعد رشید احمد صدیقی اس حوالے سے اپنی تقریر میں کہتے ہیں کہ:

''آپ کی جماعت میں بہت سے معقول اور سنجیدہ لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نا لائق اور غیر معقول ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد داخل ہوگئی ہے۔ جو ادب میں ترقی پسند کے نام پر بے راہ روی اور افراتفری پھیلاتی ہے۔ اس سے ادب کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور ترقی پسندی کے مقصد کو بھی۔'' ۲۵

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحلیم نے اپنی تقریروں میں ترقی پسند ادبی تحریک میں در آئی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ادب کو سیاست سے دور رہنا چاہیے اور موضوع کے ساتھ ہیت کی بھی اہمیت ہونی چاہیے اور ادیب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''وہ لوگ جو محض معاشی یا سیاسی نظریات کو نظم کر دیتے ہیں یا شعر کے پیمانے میں ڈھال دیتے ہیں اور ادب کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ وہ ترقی پسند تو بن سکتے ہیں لیکن ادیب نہیں۔ اس لیے کہ بجائے خود ادب کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہیئت کے پیچھے اچھے موضوع

کو تباہ نہیں کرنا چاہیے انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر موضوع صالح بھی ہو اور
زندگی کی صحت مند قدروں کی عکاسی بھی کرتا ہو اگر اسے پیش کرتے وقت ایک
خاص پیکر اور خاص انداز میں ڈھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جو زیادہ سے
زیادہ متاثر کن ہو تو پھر وہ ایک بھونڈی سچی بات ہوگی لیکن ادب نہ ہوگا۔ ۲۶

ڈاکٹر عبدالحلیم کی اس تقریر سے بہت سارے لوگوں کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ اپنی شاعری سے شرمانے لگے بلکہ نئے موضوعات کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے ہر شہر میں تنظیمیں ختم ہونے لگیں۔ مختلف رجحان کے شاعر اور ادیب اپنے اپنے علاقوں میں نئی ادبی انجمنیں اور حلقے قائم کرنے لگے۔

ترقی پسند مصنفین کی یہ انجمن ابھی اس تعطل کے رجحان میں قید تھی کہ سجاد ظہیر پاکستان سے مستقل طور پر ہندوستان واپس آ گئے۔ سجاد ظہیر کو راولپنڈی سازش کیس میں ایک ملزم کی حیثیت سے پاکستان میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ ان کی واپسی کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا۔ اس کا مقصد تھا کہ نئے حالات پر غور و فکر کر کے ایک نیا قدم اُٹھایا جائے۔ اس غرض سے مارچ ۱۹۵۶ء میں مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ اس جلسے میں یہ کہا گیا کہ موجودہ حالات میں انجمن کی تنظیم ختم کی جائے یا رکھی جائے؟ یا اگر یہ تنظیم ختم کی جائے تو اس کے اغراض و مقاصد اور نام میں کوئی تبدیلی کی جائے یا نہیں؟ اس مسلے کو حل کرنے کے لیے ایک تنظیم کمیٹی تشکیل کی گئی اور اس کا کام احتشام حسین کو سونپا گیا کہ وہ خط و کتابت کے ذریعے تمام ترقی پسند مصنفین سے تبادلہ خیال کر کے اتفاق رائے سے اس مسئلے کو حل کریں۔ سید احتشام حسین نے تنظیمی کمیٹی کی جانب سے ۳۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو ترقی پسند مصنفین کے نام ایک مراسلہ جاری کر کے انجمن کے قیام کی ضرورت اور نام کی تبدیلی

کے بارے میں رائے طلب کی۔ ابھی اس کمیٹی کا کوئی نتیجہ وجود میں نہیں آیا تھا کہ مئی ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد میں اردو کانفرنس کا اعلان کیا گیا۔

ترقی پسند مصنفین کی آخری کل ہند کانفرنس مئی ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے ملک کے بہت سے ادیبوں کو مل بیٹھ کر اس مسئلے کو طے کرنے کا ایک موقع فراہم کیا۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالحلیم اور سجاد ظہیر بھی شریک ہوئے۔ ان دونوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ موجودہ حالات میں ترقی پسند ادب کا نظریہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اب اس کی مزید اشاعت و ترویج کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی بلکہ یہ تحریک اپنا کام کر چکی ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبدالحلیم اپنی تقریر میں دیگر خیالات و نظریات کو ترقی پسند نظریات کے ساتھ شامل کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''میں اس موقع پر یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے خیالات و نظریات کی ترویج کے لیے ایسا ادارہ تو بنانا زیادہ مفید ہوگا جس میں ہر مکتب خیال کے ادیب و شاعر شامل ہوں۔ اس طرح ہم دوسرے گروہوں سے تبادلہ خیال کر کے ان کو متاثر کر سکتے ہیں۔ رجعت پسندی کا مقابلہ الگ رہ کر نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے سب کو متحد کرنا پڑے گا۔ اس اتحاد کے بعد بھی ترقی پسند عنصر باقی رہے گا۔''

۲۷

اس ترقی پسند ادیبوں کی تقاریر اور مشوروں کے باوجود آپسی اتحاد اور اتفاق قائم نہ ہو سکا اور سجاد ظہیر کو مجبور ہو کر آخر کار یہ کہنا پڑا:

> ''پہلے میری رائے یہ تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظّم کرنا چاہیے مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے اسے باعمل بنانا چاہیے، لیکن اب میں اس پر قائم نہیں ہوں۔''

۲۸؎

اس طرح ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہوئی۔ آپسی نااتفاقیوں اور اختلافات کی وجہ سے ترقی پسند تحریک پوری طرح زوال کا شکار ہوئی۔ حالاں کہ ترقی پسند تحریک اردو کی اہم ترین تحریکوں میں سے ایک تھی جس نے اردو کو چوٹی کے ادیب، شاعر اور نقاد دیئے، اس نے ایک طرف معاشی اور سماجی نابرابری کے خلاف ضمیر کو جھنجھوڑا ہے تو دوسری طرف ہندستان کی آزادی کی تحریک میں بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔ آخر کار ترقی پسند تحریک کا یہ عہد ۱۹۵۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس تحریک نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک کے دور میں اپنا جو عہد ساز تاریخی رول سرانجام دیا وہ کسی بھی ملک کی زبان و ادب کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔

******

حوالہ جات

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۴۔ سجاد ظہیر، روشنائی، سٹی ٹاور، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۔۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۶۔ ایضاً، ص ۷۰۔۱

۷۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۷۵، ۷۶۔

۸۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴۔

۹۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۷

۱۰۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص، ۶۱۔

۱۱۔ سجاد ظہیر، روشنائی، سٹی ٹاور، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۵۔

۱۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۶۵، ۶۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۱۵۔ سجاد ظہیر، روشنائی، سٹی ٹاور، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۶۳۔

۱۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۸۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۵۔

۱۹۔ سجاد ظہیر، روشنائی، سٹی ٹاور، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۴۔

۲۰۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۷۔
۲۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۸۹، ۹۰۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۹۶۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۹۶۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۹۷۔
۲۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۰۲۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔
۲۸۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۰۔

*****

باب دوم

﴿ اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ﴾

(نمائندہ افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ جس نے ادبی تصورارت پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ اس تحریک سے جو اصناف متاثر ہوئے، اُن میں خاص طور پر افسانہ، شاعری اور تنقید قابلِ ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے دوسری اصناف کے مقابلے میں اردو افسانے کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ترقی پسند اردو افسانے کے ابتدائی نقوش پریم چند اور افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک کے اعلان اور منشور ترتیب دینے والوں میں بیشتر افسانہ نگار پیش پیش تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک اور اس کے مقصد کے تحت افسانہ فی الحقیقت زندگی کے مسائل کا ترجمان بنا۔ اس میں جمہوریت آزادی، اشتراکیت، غلامی، آمیریت، مذہبی اجارہ داری، طبقاتی کشمکش، معاشی استحصالی، نسلی برتری، نفسیاتی اور جنسی اُلجھن وغیرہ جیسے زندگی کے سبھی گوشے زیرِ بحث آئے۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ ان لوگوں نے اپنے افسانوں میں ملکی موضوعات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی موضوعات کو جگہ دی اور دنیا کے دبے کچلے ہوئے لوگوں کی زندگی اور مسائل کو موضوع بنایا، غرض ترقی پسند افسانے نے تعصّبات کی دُھند کو صاف کیا اور عوام دوستی کی مثال قائم کرتے ہوئے ان کے حقوق کا تحفظ کیا اور انھیں اپنی خودی کا احساس دلایا۔ ترقی پسند افسانہ کی

وسعت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں۔

''ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی روایت کو نہ صرف یہ کہ آگے بڑھایا بلکہ وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار زندگی کے نئے مسائل اور فن کی نئی نت نئی راہوں کو اپنے فن میں سمو کر ایک نئی روایت قائم کی۔'' ۱

ترقی پسند تحریک کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، اختر حسین رائے پوری، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، خوجہ احمد عباس، عزیز احمد، دیوایندر ستیارتھی، مہندر ناتھ، اور ہنس راج رہبر، کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں چند نمائندہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں ترقی پسند افسانے کے اثرات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

ا۔ کرشن چندر:

اردو افسانے کو اہم موڑ عطا کرنے اور ترقی دینے میں جن افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے، اُن افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک اہم نام کرشن چندر کا ہے۔ کرشن چندر اس تحریک کے اہم رکن تھے۔ مارکس کے نظریات کے سلسلے میں، اردو فکشن میں کرشن چندر کے خیالات کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کرشن چندر نے ۱۹۳۶ء میں لکھنا شروع کیا۔ ترقی پسند تحریک کا اور کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا دور تقریباً ایک ہی رہا ہے۔ ابتدا میں وہ رومانی طرز کے افسانے لکھا کرتے تھے۔ خصوصاً کالج کے زمانے میں اُنھیں لاہور اور جموں کے درمیان سفر کرنا پڑتا تھا۔ اسی سفر کو کرشن چندر نے اپنے ابتدائی افسانوں کا موضوع بنا کر وادی کشمیر کی رومان پرور فضا کے پس منظر میں افسانے لکھے۔ کرشن چندر نے پہلی بار چار کہانیاں مینڈھر میں لکھیں۔ جن میں ''جہلم میں ناؤ پر''، ''آنگن''، ''قصور کی رات'' اور ''یرقان'' ہیں۔

کرشن چندر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''طلسم خیال'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔اس میں جو افسانے شامل ہیں اُن میں رومانیت غالب ہے۔ان افسانوں کا موضوع جھیلیں ،جنگل، مہکتے پھول، پرندے شمشاد وصنوبر کے نرم ونازک سائے ،سرسراتی ہوائیں، پورے چاند کی رات ،یہی سب کچھ کرشن چندر کے ابتدائی افسانے کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔اگر چہ ان کے افسانوں کی فضا رومانی ہے مگر یہ رومانیت دیگر افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔اس رومانیت کے اندر بغیر بناوٹ کے انھوں نے بہترین منظر نگاری کی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کرشن چندر کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''کرشن چندر کی طبیعت کا بنیادی جوہر اِن کی حُسن کاری ہے فطرت پرستی جو بالکل سامنے کی چیز تھی۔ پہلے دور میں اسی کا وفور اور شدت ہے۔کرشن چندر کی نثر کا بہاؤ اور شعریت اسی حسن کاری کا کرشمہ ہے۔وہ شخص جو پوری کائنات کا ایک ''طلسم خیال'' یا حسن کدہ کے طور پر دیکھتا ہو یا ''زندگی کے موڑ پر''، ''ٹوٹے ہوئے تارے'' وہ ایسے افسانے کیوں نہ لکھے گا جن میں قدم قدم پر ''نظارے'' ہوں گے ان میں جھیلیں ،جنگل، دریا، شکارے اور وادیاں ہیں، اخروٹ، سیب، خوبانی ،اور ناشپاتی کے پیڑ ہیں۔ چیری کے پھول اور زعفران کے شگوفے ہیں، خوبصورت لڑکیوں کی اُداس آنکھیں اور مانجھیوں کے گیت ہیں۔ ۲

کرشن چندر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''نظارے'' ہے۔جس میں انھوں نے رومان کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری پر بھی زور دیا ہے۔''زندگی کے موڑ پر''، ''دوفرلانگ سڑک''، ''ٹوٹے ہوئے تارے''، ''بالکنی''، اور ''جنت وجہنم'' ان سبھی افسانوں میں ہمارے اطراف واکناف کے سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔مجموعی طور پر کرشن چندر نے ان افسانوں میں منظر نگاری اور جذبات نگاری کے عمدہ

نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقریر اور تحریر کی آزادی پر جب بمبئی گورنمنٹ نے پابندی عائد کی تو انھوں نے ''بت جاگتے ہیں'' لکھا۔ جب ترقی پسند تحریک کی کانفرنس بھیمڑی میں جون ۱۹۴۹ء میں ہوئی ہے۔ اس وقت کرشن چندر نے افسانہ ''مہالکشمی کا پُل'' لکھا۔ یہ بمبئی کا افسانہ ہے اس میں مزدوروں اور عام انسانوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے بڑی خوبصورتی سے ساڑی کے رنگوں کو زندگی کے رنگوں کی علامت بتاتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ سبھی ساڑھیاں جن عورتوں کی ہیں ان کی زندگی بھی ایک جیسے مسائل سے دوچار ہے۔ درد و غم، سب کی کہانیوں میں بھورے رنگ کی طرح مشترک ہے۔ مثلاً اقتباس دیکھیے:

'' ادھر جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے۔ یہ شانتا بائی کی ساڑھی لٹک رہی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر وہ گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں میں اِسے دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ سیاہی بھورا ہے۔ جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کریں گے۔ میں بھی جب ان پہننے والیوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسرے بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔'' ۳۶

کرشن چندر کے یہاں کردار نگاری پر نظر ڈالی جائے تو اچھے نمونے موجود ہیں۔ جیسے تائی

ایسری، کالو بھنگی، موبی، کچرا بابا اور دانی ایسے کردار ہیں جو زندگی اور زندگی کی حرارت سے معمور ہیں۔ کرشن چندر نے جو علامتی افسانے لکھے ہیں۔ اُن میں ''پانی کا درخت''، ''مردہ سمندر''، ٹیڑھی میڑھی بیل'' ، وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سائنسی موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً ''ربڑ کی عورت''، ''ہائیڈروجن بم کے بعد'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں سائنسی ایجادات کو تخیل کے ساتھ برتا گیا لیکن یہ افسانے زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کی خوبصورت منظر نگاری یا رومانی استعارات، دل کش اور لطیف انداز و بیان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعرانہ مزاج لے کر ادب میں آئے مگر نظم کے بجائے نثر نگاری ان کے حصے میں آئی۔ ان کے افسانوں کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے حامدی کشمیری لکھتے ہیں:

> ''اگر آرٹ اور سائنس کے مدو جزر سے آگے صدیوں میں کہانی کا فن سر سے بدل بھی جائے کرشن چندر کی تکنیک بالکل متروک ہو جائے تب بھی اگلی نسلوں کو زندگی کی سوجھ بوجھ انسانی ہمدردی حسن شناسی اور اخلاقی لوچ کا درس دینے کے لیے کرشن چندر کے دو پہر دستک دینی پڑے گی۔'' [۴۲]

۲۔سعادت حسن منٹو

کرشن چندر کے بعد دوسرا اہم نام سعادت حسن منٹو کا آتا ہے۔ منٹو اردو افسانہ نگاری کے اہم ستون ہیں۔ ابتدا میں منٹو پر روسی ادیبوں کا گہرا اثر رہا ہے۔ گوگل، ترگیف، چیخوف اور گورکی کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ ان کی زندگی اور ان کے فن پر منٹو نے کافی مطالعے کرنے کے بعد مضامین بھی لکھے جیسے ایک مضمون ''سرخ انقلاب'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ اشتمالیت نے روسی عورت کو اس کی صدیوں کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے۔ منٹو گورکی کے بارے میں اظہار خیال

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’گورکی افسانہ لکھنے سے بیشتر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر حقیر واقعات کو بھی فراہم کر لیتا ہے کہ شاید وہ کسی جگہ کے لیے موزوں ہوں۔شوربے کی تلخی،مرد کے بوٹ سے چمٹی ہوئی برف،کسی عورت کے بالوں میں اٹکے ہوئے برف کے گالے،لکڑیاں کاٹتا ہوا لکڑ ہارا، دہکانوں کی بھری گفتگو، پیانوں کے چھیڑتے ہوئے پردے،سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک، بازاروں میں اُڑتی ہوئی کیچڑ،اور کارخانوں کے بلند دورکشوں کا سیاہ دھواں ان تمام کم حقیقت اور مہمل چیزوں کے اجتماع سے اس کا دست فکر ایسے مناظر پیش کرتا ہے جو اپنے اندر اثر پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔‘‘ ۵

۱۹۳۵ء کے بعد یعنی ترقی پسند نظریے کے تحت اردو افسانے کا موضوع طبقاتی کشمکش اور سماج کے دیگر مسائل بن گیا تھا فکری طور پر منٹو بھی اس کی طرف راغب ہوئے،لیکن وہ اس دائرے تک محدود نہ رہے بلکہ اس سے بلند ہو کر پورے سماج اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔منٹو کے افسانے سماجی نوعیت کے ہیں جن میں انہوں نے طبقاتی نظام کے نتیجے میں نچلے طبقے کے لوگ،ان کے ذہن،سماجی،نفسیاتی،اور جنسی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔منٹو اپنے دور کے سب سے زیادہ باغی تخلیق کار اور فحش نگار بھی قرار دیے جاتے ہیں۔منٹو ایک حقیقت نگار تھے انھوں نے اپنے زمانے میں پوشیدہ جنسی برائیوں کو اپنے افسانوں کے ذریعے بے نقاب کیا ہے۔طوائف کی زندگی پر بھی منٹو نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔جیسے افسانہ’’کالی شلوار‘‘،’’ہتک‘‘،’’دس روپے‘‘،’’جانکی‘‘،’’سوکینڈل پاور کا بلب‘‘،اور’’سرکنڈوں کے پیچھے‘‘وغیرہ جیسی بہترین کہانیاں لکھی ہیں۔منٹو کے فن پر طرح طرح سے نکتہ

چھینی کی گئی، اعتراضات کیئے گئے اور مقدمے بھی چلائے گئے لیکن پلڑا منٹو کی ہی طرف جھکا اور انھیں سرخروئی حاصل ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فحش نگاری منٹو کی کمزوری ہے۔لیکن انھوں نے مخفی رازوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے جنسی موضوعات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔منٹو ایک کامیاب حقیقت نگار کی حیثیت سے اُبھرے ہیں۔انہوں نے بڑی بے باکی سے سچائی کا انکشاف کیا ہے اور انھوں نے جنس کو عام زندگی سے الگ نہیں کیا بلکہ اس کے پس پردہ زندگی کی ناہمواریوں پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے اپنے افسانے کسی مخصوص نظریے یا اخلاقی وتہذیبی مصلحت پسندی کے تحت نہیں لکھے بلکہ اُن سے ہٹ کر زندگی کو اس کے اصل روپ میں لانے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کو باشعور ترقی پسند اور بے باک حقیقت نگار کہا گیا ہے۔منٹو کے افسانوں میں ان کے حقیقی رویہ اور فنکارانہ نظریے کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

> ''وہ حقیقت کو دیکھتے، چھوتے، محسوس کرنے کے عمل سے گزر کر اس کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کا بطور مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر افسانوں میں نہایت بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔جنسی اور نفسیاتی حقائق کے بے محابا اظہار میں منٹو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ دھواں، ہتک، نیا قانون، ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور کھول دو ایسے افسانوں میں ان کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔'' ۶

منٹو کے ترقی پسند ہونے کی دلیل میں زیادہ تر نقاد ''نیا قانون'' افسانے کو پیش کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانہ ''نیا قانون'' منٹو کی قلم سے تحریر کیا ہوا ایک شاہکار افسانہ ہے لیکن جہاں تک

منٹو کی حقیقت نگاری کا تعلق ہے تو منٹو نے اس ضمن میں جو کچھ بھی تخلیق کیا وہ بے باک حقیقت نگاری کے زُمرے میں رکھا جاتا ہے۔افسانہ ’’نیا قانون‘‘ میں منٹو نے کوچوان کے کردار کو کچھ اس قدر فطری انداز میں پیش کیا ہے کہ منٹو کی کردار نگاری کی عظمت کا اعتراف کرنا ہی پڑھتا ہے۔کہانی دراصل ۱۹۳۷ کے ’’گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ‘‘ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔کہانی کا کردار سوچتا ہے کہ نیا قانون لاگو ہو گیا ہے بلکہ اب ہندوستان آزاد ہے اور انگریز یہاں سے چلے جائیں گے۔منٹو نے اس افسانے کے کردار منگو کوچوان کے جذبات کی بڑی حسین عکاسی کی ہے۔جیسے یہ ایک اقتباس دیکھیئے :

’’ گورے نے ادھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔وہ گورے کو جی بھر کر پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا تھا ’’پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ خوں۔۔۔۔۔۔پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ خوں،اب ہمارا راج ہے بچہ۔‘‘ ۷

مذکورہ اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ منٹو نے منگو کوچوان کی معصومیت اور اس کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت کو بڑی فنکاری سے قلم بند کیا ہے۔افسانہ ’’نیا قانون‘‘ میں منٹو کی کردار نگاری پر وارث علوی اظہار خیال کرتے ہو لکھتے ہیں :

’’افسانہ کی جان منگو کوچوان کا کردار ہے۔ایک عام اور بالکل معمولی آدمی میں دلچسپی کے اتنے پہلو پیدا کرنا منٹو کو کردار نگاری کا امتیازی وصف ہے۔‘‘ ۸

''نیا قانون'' اپنے موضوع اور کردار نگاری کے اعتبار سے ایک عمدہ افسانہ ہے اور منٹو کے ترقی پسند ہونے کی دلیل بھی ہے۔ منٹو نے بہت ہی مختصر سی زندگی پائی لیکن افسانوی ادب کی خدمات میں وہ کسی طویل عمر پائے جانے والے افسانہ نگار سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ اُن کی تصانیف کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ ''آتش پارے''، ''سرگزشت''، ''اسیر''، ''منٹو کے افسانے''، ''دھواں''، ''شکاری عورتیں''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''گنجے فرشتے''، ''بادشاہت کا خاتمہ''، ''نمرود کی خدائی''، ''سڑک کے کنارے''، ''پھندے''، ''شیطان''، ''نیلی رگیں''، کالی شلوار''، ''بغیر اجازت''، ''رتی ماشا اور تولہ''، ''پرند''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''بڈھا کھوسٹ''، ''سیاہ حاشیے''، ''گلاب کا پھول''، ''چغد''، ''لذت سنگ''، ''جنازے'' ان افسانوں سے منٹو کی بے پنا صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منٹو کے فن کا محاکمہ کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''منٹو کے نظریات کو سامنے رکھ کر جو اس کے دورِ آخر کی پیداوار تھے اس کے سارے کارناموں کو رجعت پسند قرار دینا یا ادبی حیثیت سے مسترد کر دینا درست نہ ہوگا۔ اس کے صالح عناصر اور اس کی وہ بے لاگ حقیقت نگاری جو سماج کی بعض حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ اسے ترقی پسند افسانہ اپنی بنا کر رہے گا۔'' 9

وطن تقسیم ہونے کے بعد برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر اردو میں ان گنت افسانے لکھے گئے ہیں۔ لیکن اکثر لکھنے والے اس ضبط و توازن کا ثبوت نہ دے سکے جس کا ثبوت منٹو نے دیا ہے۔ جیسے ان کا افسانہ ''کھول دو''، ٹھنڈا گوشت''، اور شریفن کے علاوہ سیاہ حاشیے کے بیش تر افسانچے بھی فسادات کی عکاسی کرتے ہیں۔

۳۔راجندر سنگھ بیدی

زیر بحث موضوع کی اگلی کڑی راجندر سنگھ بیدی ہے۔راجندر سنگھ بیدی کا نام پریم چند کے بعد تین افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔اردو افسانے کو نئی سمت عطا کرنے میں منٹو،عصمت،اور کرشن چندر کے ساتھ بیدی کا بھی اہم رول رہا ہے۔ان افسانہ نگاروں میں بیدی بحیثیت افسانہ نگار کئی اعتبار سے مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ بیدی کا اپنا مخصوص اسلوب ہے،ان کی زبان پر پنجابی زبان کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ان کے جملے پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ پنجاب کی مٹی کی خوشبو الفاظ سے پھوٹ رہی ہے۔پنجاب کی سرزمین سے اور بھی کئی لکھنے والے وابستہ ہیں لیکن پنجاب کی جو تہذیب بیدی کی زبان اور افسانوں میں ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی ہے۔بعض ناقدین بیدی کی زبان پر سخت اعتراض کرتے ہیں اور بیدی کے افسانوں کو کمزور قرار دیتے ہیں۔وقار عظیم بیدی کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جن باتوں کو آسان اور سیدھی باتوں میں کہہ کر موثر بنایا جاسکتا ہے انھیں بیدی نے دقیق اور مشکل زبان میں کہا ہے اور اس سے ہر جگہ افسانے کی فضا میں ایک بوجھل پن پیدا ہو گیا۔اس میں تصنع آ گیا اور بات میں شاید وہ تاثیر بھی باقی نہیں رہی جو افسانے کی مجموعی فضا کے لحاظ سے ضروری تھی۔'' [۱۰]

بیدی نے یوں تو بہت سارے افسانے تخلیق کیے ہیں سبھی افسانے اپنی اپنی جگہ انفرادیت کے حامل ہیں۔لیکن فنی اور فکری اعتبار سے افسانہ ''بھولا''،''گرہن''،''لاجونتی''،''اپنے دکھ مجھے دو''،''گرم کوٹ''،''لمبی سڑک''اور''صرف ایک سگریٹ'' قابلِ ذکر ہیں۔''بھولا'' بیدی کا ایک خوبصورت افسانہ ہے جو ایک بچے کی نفسیات کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ بیدی نے اس افسانے کے ذریعے سماج میں پھیلی

ہوئی قوم پرستی کو بے نقاب کیا ہے اور بچے کی نفسیات کو بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ اُبھارا ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں نہیں آوں گا۔۔۔۔تیرے پاس بابا

کیوں بھولے؟

بھولا بابا جی کا نہیں۔۔۔بھولا ماتا جی کا ہے۔'' ۱۱

مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بیدی نے حالات و واقعات کی عکاسی میں حقیقت نگاری اور جزئیات نگاری کا جس طرح حق ادا کیا ہے وہ اس افسانے کو بیدی کی افسانہ نگاری کا اہم افسانہ بنا دیتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور بیدی کے افسانوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیدی نے جب کہانیاں لکھنا شروع کیں تو پریم چند اور ترقی پسند تحریک کے اثر سے سماجی موضوعات بہت مقبول تھے یہ اور بات ہے کہ ان میں رومانیت، جذباتیت اور خطابت تھی۔ بیدی کی کہانیاں رومانی ہونے کے بجائے حقیقت پسند جذباتی ہونے کے بجائے ایک گہری سوچ کی آئینہ دار خطبہ ہونے کے بجائے ایک لطیف طنز کی حامل تھیں۔'' ۱۲

بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز دورانِ طالب علمی سے ہی ہوگیا تھا لیکن ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دانہ ودام'' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں بیدی نے حقیقت نگاری اور دیہاتی زندگی کو حقیقی فضا میں پوری سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں بیدی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''گرہن''

شائع ہوا۔اس مجموعے میں بھی چودہ (۱۴) افسانے ہیں۔مارچ ۱۹۴۹ء میں تیسرا افسانوی مجموعہ ''کوکھ جلی'' شائع ہوا، جس میں تیراہ (۱۳) افسانے شامل ہیں۔ان کے علاوہ ''اپنے دکھ مجھے دو''، ''ہاتھ ہمارے قلم'' اور ''مکتی بودھ'' بیدی کے افسانوی مجموعے ہیں۔

بیدی نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بہت کم افسانے لکھے لیکن فن اور تکنیک کے لحاظ سے بیدی کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں میں ہندوستانی رسم ورواج کی بڑی خوبصورت تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے افسانے اپنے موضوع اور کرداروں کی نفسیاتی تحلیل اور کردار نگاری کی وجہ سے انفرادیت رکھتے ہیں۔بیدی کے افسانوں کی ایک خوبی انسانی نفسیات ان کی مضبوط گرفت بھی ہے وہ اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعے انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بیش تر کردار کسی خاص جذباتی ونفسیاتی رویے کی شناخت کا سبب بنتے ہیں۔

۴۔عصمت چغتائی

اردو افسانے کی تاریخ میں ایک اور اہم نام عصمت چغتائی کا ہے۔عصمت چغتائی اردو کی پہلی بے باک خاتون افسانہ نگار ہے۔ جہاں کرشن چندر اور بیدی اپنی اپنی شناخت رکھتے ہیں وہاں منٹو اور عصمت کا میدان کئی لحاظ سے مشترکہ ہے۔ یوں تو عورت کی زندگی اور اس کے جنسی مسائل کو بہت سارے افسانہ نگاروں نے قلم بند کیا ہے لیکن منٹو اور عصمت کے افسانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عصمت نے ان مسائل کو عورت ہی کے زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے بلکہ انھیں خواتین کے مسائل سے بے پناہ دلچسپی تھی۔عصمت کے افسانوں کا موضوع عام گھروں کے سماجی مسائل اور خصوصی طور پر جنسی مسائل ہیں۔دراصل عصمت نے اپنے آس پاس کے ماحول اور مسائل کو اپنی فن کارانہ صلاحیت کے سہارے

بہترین اسلوب کے ذریعے بیان کیا۔ عصمت کی انفرادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی کو اردو افسانے کی خاتون کہا گیا ہے۔ یہ خیال اس لحاظ سے درست نہیں کہ ان کی شہرت اور بڑائی کا انحصار ان کے خاتون ہونے پر نہیں، ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت اور مشاہدہ کی وسعت پر ہے اور اس سے ہے کہ انھوں نے زندگی کی ان سچائیوں سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ کیا جنہیں ان سے قبل کے افسانہ نگاروں نے نظر انداز کیا تھا۔'' ۱۳

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں مسلمانوں کے متوسط نچلے طبقے اور اس میں سانس لیتی ہوئی لڑکیوں اور اس طبقے کی تہذیبی اور گھریلو زندگی کے بعض حالات کو موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصمت ہندوستانی عورت کی نفسیات بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتی ہے۔

فنی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو عصمت چغتائی کا پہلا افسانہ'' کافر'' ہے جو ماہنامہ'' ساقی'' دہلی اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، اسے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ'' کلیاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں تیرہ افسانے اور چار ڈرامے شامل تھے۔ اس کے علاوہ'' چوٹیں''،'' ایک بات''، چھوئی موئی''،'' دو ہاتھ''،'' بدن کی خوشبو''،'' امر بیل''،'' تھوڑی سی پاگل''،'' آدھی رات آدھا خواب'' اور'' دوزخی'' وغیرہ اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں وہ افسانے آتے ہیں جن میں اُنھوں نے گھریلو مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جیسے افسانہ'' گیندہ''،'' جوانی''،'' چوتھی کا جوڑا''،'' اُف یہ بچے''،'' لحاف''،'' بھول بھلیاں''،'' ساس''،'' نفرت''،'' جال''،'' چھوٹی آپا'' وغیرہ اہم

افسانے ہیں جن میں صرف دبی کچلی عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ جنسی گھٹن کا وہ احساس جو عورتوں کو ایک دوسرے کے سامنے دبے لہجے میں اظہار کرنے میں مجبور کرتا ہے۔ ان موضوعات کی بھر پور عکاسی ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور ۱۹۵۰ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے یہ وہ دور ہے جب تقسیم وطن نے عوام کو گہرے زخم دیے تھے، وہ رفتہ رفتہ مندمل ہو رہے تھے۔ اور ان سے وابستہ موضوعات کے اثرات بھی بہت کم ہو رہے تھے۔ ''ننھی کی نانی'' اور ''دو ہاتھ'' جیسے اس دور کے اہم افسانے ہیں۔ جن میں مشاہدہ کی وسعت اور زندگی کی حقیقت نظر آتی ہے۔

''ننھی کی نانی'' افسانے کا شمار عصمت کی مشہور تخلیقات میں ہوتا ہے۔ یہ افسانہ محلّہ ٹولے میں رہنے والی ایک غریب بوڑھی اور بیوہ عورت کی داستان ہے۔ ان افسانے میں عصمت نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح دل میں درد کا طوفان چھپا ہونے کے باوجود زندگی بسر کرنے کا راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ ''ننھی کی نانی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سرکار خس خانہ میں قیلولہ فرما رہے تھے، ننھی پنکھی کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی، پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی، شیطان جاگ اُٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔ کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لیے مختلف ادویات اور تلاؤں کے ساتھ حکیم وید چوزوں کی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔''[۱۴]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عصمت چغتائی عوام کی زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ان کو مؤثر انداز میں اپنی قلم کی روشنائی بخشتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ضعیف کرداروں کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے مثلاً ''ننھی کی نانی''، ''چوتھی کا جوڑا'' کے کردار

جیسے نانی اور اماں جی یہ ایسے کردار ہیں جو بالکل حقیقی اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔

عصمت چغتائی عورتوں کے بارے میں مختلف زاویوں سے لکھتی ہے۔ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

> ''اگر ذہنی تعصّبات سے اُٹھ کر ''کلیاں''، چوٹیں''، اور ''ایک بات'' کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان افسانوں میں عصمت کا فن اپنے عروج پر ہے ان کا مشاہدہ گہرا ہے وہ اپنے معاشرے ناہمواریوں اوراس معاشرے کے پروردہ لوگوں کے نفس کی گہرایوں پر بھی نظر رکھتی ہے اور اپنے افسانوں میں بے حد فن کارانہ انداز میں ان کا اظہار کرتی ہے۔'' [۱۵]

۵۔حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری بھی ترقی پسند تحریک کے مضبوط اور اہم ستون مانے جاتے ہیں۔اُنھوں نے اپنا ادبی سفر ۱۹۳۰ء سے شروع کیا۔اس دور کے بعد جو بھی افسانہ نگار اُبھر کر سامنے آئے ان کے بیشتر افسانوں نے زندگی کی تفسیر اور ترجمانی کا کام کیا اور اس حقیقت نگاری کو آگے بڑھانے میں حیات اللہ انصاری خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔حیات اللہ انصاری نے ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح مشاہدہ کی طرف کافی زور دیا اور ان کے افسانے مشاہدے،فکر اور تخیل کے ساتھ کہانی کا قالب اپناتے ہیں۔حیات اللہ انصاری نے بے شمار افسانے لکھے جیسے افسانہ ''آخری کوشش'' لکھا۔اس افسانے نے کافی شہرت پائی اور بہت سے ناقدین آج بھی انھیں اسی افسانے سے یاد کرتے ہیں۔پروفیسر قمر رئیس حیات اللہ انصاری کے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

''حیات اللہ انصاری ترقی پسند تحریک سے شروع سے ہی وابستہ رہے۔اگر چہ
بعض ترقی پسند ادیبوں کے رویے سے وہ خوش نہیں تھے تاہم ترقی پسند ادیبوں
کے متحدہ محاذ میں وہ ایک ارفع اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔'' ۱۶؎

حیات اللہ انصاری کا پہلا افسانوی مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ''بڑھا سودخوار'' ہے۔ جو جون ۱۹۳۸ء کے شمارے میں جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب پریم چند کی حقیقت نگاری کا زمانہ عروج پر تھا۔ حیات اللہ انصاری بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح پریم چند سے متاثر ہوئے اور دوسرا افسانوی مجموعہ ''بھرے بازار میں'' ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''شکستہ کنگورے'' کے نام سے شائع ہوا۔ ''انوکھی مصیبت'' کے بعد ان کے افسانوں کا فن کچھ اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں اُن کی اپنی مخصوص انفرادیت نے بھی اپنی وضع شناخت بنالی ہے۔ جس کے نقش ان کے اولین افسانوی مجموعوں میں نمایاں ہیں۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں سماج کے نچلے طبقے اور اس کے حقیقی خدوخال کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ مشاہدات اور واقعات کو سرسری طور پر نہیں لیتے بلکہ انھیں اپنے تجربے کا پُورا حصہ بنالیتے ہیں۔ ان کی یہ حقیقت نگاری بہت سے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ بالخصوص '' ڈھائی سیر آٹا'' جس کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا بلکہ یہاں تک اس افسانے کو اردو کا اولین مارکسٹ افسانہ کہا جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے اس افسانے میں مزدور طبقے کی بے بسی کو موضوع بنایا ہے کہ کیسے ایک مزدور سخت محنت ومشقت کے باوجود مزدوری میں ملے پیسوں سے اپنی بیوی اور بچوں کو پیٹ بھر روٹی تک کھلا نہیں پاتا۔ اس کے حالات اتنے بدتر ہیں کہ ایک دن بیمار پڑھنے پر بیوی بچوں کو فاقوں کی نوبت آجاتی ہے۔ ایک روز سڑک کے کنارے زمیندار کے گھر سے پھینکے گئے بدذائقہ آٹے کو

دیکھ کر ’’مولا‘‘ نام کا کردار سب کچھ بھول کر باقی مزدوروں کی نظروں سے بچ کر آٹا اُٹھانے لگتا ہے۔ مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ پانچ چھے مزدوروں کی ٹولی پاس سے گزری اور یہ عیب تماشا دیکھ کر تین مزدور کھڑے ہو گئے۔

ایک۔ ’’کیا مل گیا مولا‘‘۔

مولا۔ ’’کچھ نہیں خراب آٹا ہے مگر ہے تو اناج پیروں تلے آرہا ہے‘‘

میں نے کہا مرغی بکری کھالیں تو سوارت ہو جائے۔

دوسرا۔ ’’کیا گلی پڑی ہوئی! کہیں نظر گزر نہ ہو‘‘۔

پہلا۔ ’’اُٹھالے مولا اُٹھالے۔ اس کو بکنے دے کام آ جائیگا۔‘‘

مولا گردن جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور پہنچ کر ایک مزدور نے تان لگائی۔

’’سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا‘‘۔

دوسرا اس کی تان ہی کی اثنا میں بولا ’’غریب ہی سہی مگر ہم گلی سے گرا پڑا نہیں اُٹھاتے۔‘‘ [۱۷]

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھوک کی خاطر کس طرح ایک انسان کو اپنے احساسات و جذبات اور ضمیر کو فراموش کرنا پڑتا ہے۔ ملک کی ایک بڑی آبادی کو سخت محنت و مشقت کے باوجود بھی دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی۔ ان کی حالت بھکاریوں سے بھی بدتر ہے۔ حالِ حاضر میں بھی دیکھا جائے تو ملک کا وہی حال ہے جسے حیات اللہ انصاری نے پچھتر (۷۵) سال پہلے ’’ڈھائی سیر آٹا‘‘

کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر خلیل الرحمن اعظمی اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے میں ''کمزور پودا''، بھرے بازار میں''اور''ڈھائی سیر آٹا''اس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو''انگارے گروپ'' کے اثر سے بے لاگ حقیقت نگاری کو افسانے کا اولین مقصد قرار دے رہا تھا۔لیکن جس افسانے نے حیات اللہ انصاری کو قدر اول کا افسانہ نگار بنایا وہ ''آخری کوشش'' ہے۔ آخری کوشش اردو کے چند بہترین افسانوں میں سے ہے۔ اس میں گہرائی ،معنویت اور انسان کے بنیادی مسائل کا عرفان ہے ۔ یہ افسانہ ایک طرح سے پریم چند کے آخری افسانہ''کفن'' کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اس میں بھی وہ ٹھراؤ اور شعور ہے جو پریم چند کے افسانے کا خاصہ ہے ۔ حیات اللہ انصاری کہانی کے فن پر بڑی اچھی معلومات رکھتے ہیں اور اندھی تقلید سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا، یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے مغرب کے جدید افسانے کے معیار سے مطابقت رکھتے ہوئے بھی اجنبیت کا احساس نہیں دلاتے ۔ ۱۸؎

حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں شروع ہی سے مشاہدے کی باریک بینی اور فکر کے عناصر فن کارانہ انداز میں ملتے ہیں۔ان کے یہاں انفرادیت بھی ہے اور تنوع بھی۔ جہاں تک افسانے کے فن کا تعلق ہے حیات اللہ انصاری مغرب کے خوشہ چیں نہیں ہیں۔لیکن مغرب کے افسانوی آرٹ کی بہترین خصوصیات ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔زبان و بیان پر بھی ان کی گرفت مضبوط دکھائی دیتی ہے۔لطیف طنزیہ لہجے میں سماجی مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنانے میں حیات اللہ انصاری کو کمال

حاصل ہے۔ درحقیقت حیات اللہ انصاری کے افسانے زندگی کی بعض اہم اور تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

۶۔احمد ندیم قاسمی:

احمد ندیم قاسمی نے ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا ہے ان کی افسانہ نگاری کی خوبی حقیقت نگاری ہے۔ جس طرح پریم چند نے یو پی کے دیہات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اُسی طرح قاسمی نے بھی پنجاب کی دیہاتی زندگی کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چوپال'' ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی حقیقی زندگی کی موثر عکاسی ملتی ہے۔ اُتر پردیش اور بہار کے دیہاتوں کی طرح پنجاب میں بھی زمین دار، جاگیردار، سودخور، مہاجن، اور بیوپاری موجود ہیں جو محنت کش اور سادہ مظلوم دیہاتوں کی بے بسی اور جہالت سے فائدہ اُٹھانے اور ان کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے دیہاتی زندگی کے مسائل، دُکھ درد، بھوک، افلاس، سیلاب اور غربت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

احمد ندیم قاسمی افادیت اور مقصدیت کو اپنے افسانوں میں زور وشور سے لاتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی حیثیت کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے متعدد اصناف کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ ایک ایسا فنکار جس کے پاس متعدد مسائل ظاہر ہوں ایک مخصوص صنف میں اپنے تشخص کے لیے کیا کیا حربے اپناتا ہے۔ یہ مطالعہ خود ایک لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس لحاظ سے احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کئی مفید اور دلچسپ نتائج سامنے لاسکتا ہے۔'' ۱۹

احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں زندگی کے تمام کرب کا مداوا عشق ہے۔ بالخصوص

افسانہ ''طلائی مہر''، ''بھوت''، ''ہیر رانجھا''، ''ماں اور بچہ''، میں عشق کی محرومی وناکامی کے ساتھ ساتھ دیہات کی کشمکش اور بھری زندگی کی عکاسی بھی دیکھنے کوملتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے ابتدائی افسانوں میں موضوع کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن دھیرے دھیرے زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سرد وگرم فضا نے انھیں ایک واضح نقطہء نظر بخشا جس کی پیش کش میں وہ بڑی خاموشی اور نرم گفتاری سے کام لیتے ہیں۔ان افسانوں میں احمد ندیم قاسمی نے پسماندہ اور ادنیٰ طبقے کی تمام تر کمزوریوں، مجبوریوں، محبتوں اور نفرتوں کو پیش کیا ہے۔لیکن اس کے ساتھ کہیں کہیں اس طبقے کی جدوجہد اور استحصال کرنے والی طاقتوں سے اس کے تصادم کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔اس احساس اور معاشی استحصال کرنے والے ان کے افسانے جیسے،''جُوتا''، لارانس آف تھیلیپیا''،''جلسہ''،''گنڈاسا''،''شیش محل''،''بھاڑا''،''اصول کی بات''،''وحشی''اور''آتش گل''وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان کے افسانوں کی طرز واسلوب سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی عوام الناس سے گہری وابستگی ہے۔احساس وفکر نے بھی ان کے فن کو زندگی کے قریب تر کردیا ہے۔اس احساس کو وقار عظیم ان الفاظوں میں بیان کرتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کے طرز کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا شاعرانہ انداز ہے۔جوان کے تخیل کے علاوہ خود ان کے بیان پر بھی چھایا ہوا ہے۔وہ خواہ کسی چیز کا ذکر کر رہے ہوں۔غیر شاعرانہ بننا ان کے لیے ممکن نہیں۔(سوائے ان موقعوں کے جب وہ دیہات کے ماحول سے نکل کر شہر کی فضا کے ترجمان بننا چاہتے ہیں۔) مناظر کا ذکر دیہاتی زندگی کے مختلف موقعوں کا بیان اور کس رومانی منظر کی مصوری، ان میں ہر ایک کی شاعرانہ فطرت اور اس فطرت کے پیدا کیے ہوئے طرز کی جھلک ہوتی ہے۔''[۲۰]

احمد ندیم قاسمی کے متعدد افسانوں میں اگر ترقی پسندی رویے کی نشاندہی کی جائے تو انھوں نے جاگیردارنہ نظام کے خلاف، مجبور و بے کس انسانوں کو کھڑا کیا ہے۔ان کا مشہور افسانہ ''جوتا'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

''جوتا'' میں مرکزی کردار کرموں قوّال پارٹی میں تالیاں بجانے کا کام کرتا ہے۔محنت مزدوری کر کے اُس نے اپنے بچوں کو تعلیم دلائی۔ بچّے نوکری حاصل کر کے اچھا کمانے لگے۔کرموں کے دن بدل گئے۔لیکن گاوں کے چودھری کو یہ سب کچھ پسند نہ تھا۔اُسے نچلے طبقے کے سارے لوگ ذلیل وخوار ہی نظر آتے ہیں۔کرموں نے کچھ لوگوں کے مابین یہ کہا کہ سوچتا ہوں گھر ٹھیک سے بنواؤں اور ایک بیٹھک بنواؤں جس میں پلنگ اور مونڈھے بچھا کر لوگوں سے دنیا جہاں کی پیاری پیاری باتیں کروں۔ یہ بات چودھری تک پہنچی تو وہ آگ بگولہ ہو کر کرموں کو بلواتا ہے اور جوتے پڑواتا ہے۔اقتباس دیکھیے:

> ''اس نے دارے پر قدم رکھا ہی تھا کہ تین چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ کر گرادیا اور چودھری کا پلا ہوا منشی اس کے پیٹ پر جُوتے برسانے لگا ساتھ ساتھ چودھری اسے گالیاں دیتے رہا اور کہتا رہا' بیٹھک بنائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری طرح ؟ چار پیسے کیا آ گئے کہ اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل، لگاو۔اور لگاو۔''
>
> کرموں کو اتنے جُوتے لگے کہ کسی اور کو لگتے تو وہ گنتی بھول جاتا،مگر کرموں گنتا رہا ۔'میں تو گنتا رہا'۔اس نے اپنے ملنے والوں کو بتایا۔''میں گنتا رہا تا کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے جوتوں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہوجائے۔باسٹھ لگے تھے۔باسٹھ پورے کروں گا خدا کے حضور انشاءاللہ۔ایک

کے ستّر نہ سہی۔ چودھری کے لیے تو میرا ایک ہی جوتا بہت ہے سارے جہاں
کے مخلوق کے سامنے۔'' ۲۱

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے زوال پزیر ہوئے جاگیردارانہ نظام کی حالت اور پسماندہ طبقات کے ظلم وستم کے خلاف دھیمی احتجاجی کیفیت کو بخوبی بیان کیا ہے۔

آخر کار ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دور میں اردو افسانہ موضوع اور تکنیک کی سطح پر انقلابی تبدیلیوں سے روشناس ہوا اور ایسے تجربات کیے گئے۔ جس نے اسے اعتبار اور وقار بخشا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے بے باکی اور صاف گوئی کو نصیب العین قرار دیا۔ حق اور انصاف کی حمایت انھوں نے بے رحمی اور بے دردی سے کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند افسانہ اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس دور کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں نے اپنی حقیقت کے زیر اثر دیہاتی زندگی کے افسانوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے بہترین عناصر اور اقدار کے تقریباً تمام پہلو اُجاگر کیے۔ غرض ترقی پسند افسانہ نگاروں نے یہاں ایک طرف اپنی حقیقت نگاری کے زیر اثر ہم اثر ادبی اور سیاسی مسائل کی حقیقی اور فن کارانہ پیش کش سے اپنے عہد کے تقاضوں اور اپنے منصبی فرائض کو ادا کیا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہم عصر سماجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر کے مشترکہ تہذیب وثقافت کی تاریخ بھی قلم بند کی ہے۔ اسی لیے اردو افسانے کی تاریخ میں یہ دور اپنی سماجی خدمات کے لحاظ سے نمایاں نظر آتا ہے۔

*****

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۴۔

۲۔ مرتبہ اطہر پرویز، اردو کے تیرہ افسانے، (اشاعت اوّل)، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۴۱۔

۳۔ مرتبہ وہاب اشرفی، کہانی کے روپ، کرن اشاعت ہوس گیا، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۷۔

۴۔ مرتبہ حامدی کاشمیری، انصاری باز یافت، شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی، سرینگر، ۱۶۵۱۹۸۲۔

۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۸۸۔

۶۔ قمر رئیس، ترقی پسند افسانے کے پچاس سال، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۲۹۔

۷۔ مرتبہ اطہر پرویز، منٹو کے نمائندہ افسانے، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۷۷، ص ۴۳۔

۸۔ وارث علوی، سعادت حسن منٹو، سُپر پرینٹرس، دہلی، ص ۴۴۔

۹۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، (تیسرا ایڈیشن علی گڑھ)، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۱۔

۱۰۔ اسلم جمشید پوری، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، نئی، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۸۴۔

۱۱۔ راجندر سنگھ بیدی۔ دانہ ودام، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۔

۱۲۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، (اشاعت دوم)، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۸۰۔

۱۳۔ پروفیسر قمر رئیس، نیا افسانہ، مسائل اور میلانات، اردو اکاڈمی، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۔

۱۴۔ عصمت چغتائی، عصمت چغتائی کے یادگار افسانے، شعیب پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۶۔

۱۵۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، (اشاعت اوّل)، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۶۴۔

١٦ وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل ہاؤس دہلی، ۱۹۹۰ء، ص، ۱۴۹۔

١٧ حیات اللہ انصاری، بھرے بازار میں، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۵۱، ۵۲۔

١٨ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تیسرا ایڈیشن، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۳، ۱۸۵۔

١٩ ڈاکٹر قاسم ظفر خان، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، بہار، ۱۹۹۶ء ص ۸۔

٢٠ وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۱۔

٢١ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۸۸۔

******

باب سوم

﴿جموں وکشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات﴾

جموں وکشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات

پس منظر

ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے باقاعدہ آغاز کے بعد چند برسوں میں ہی اس تحریک نے ملک کے تقریباً ہر حصے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔اُس وقت ریاست جموں وکشمیر نہ ہی اردو کا علاقہ تھا اور نہ ہی اردو یہاں کے لوگوں کی زبان تھی۔لیکن پھر بھی یہاں کے ادیبوں نے اس زبان کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔اس زمانے میں ریاست جموں وکشمیر میں سیاسی سطح پر زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔مقامی طور پر مسلم کانفرنس کشمیر کی بڑی سیاسی جماعت تھی۔جو بعد میں نیشنل کانفرنس کے نام سے عمل میں آئی۔جس کی قیادت شیخ محمد عبداللہ جیسے روشن دماغ کے ہاتھ میں تھی۔اس جماعت نے جو سیاسی عمل اپنایا اُسے قومیت کا نام دیا گیا اور اس کے ڈانڈے ہندستان کی تحریک آزادی سے ملا لیئے۔چنانچہ ریاست میں ڈوگرہ شاہی کے استحصال اور ضد کے خلاف آواز بلند ہوئی اور اس جماعت کی قیادت نے غلامی،افلاس،اور ناداری کے خلاف جنگ لڑی۔

اُسی زمانے میں پریم ناتھ سادھو رونق کے نام سے ایک نوجوان ادیب اردو ادب کے حلقوں میں اُبھر رہا تھا جو بعد میں پریم ناتھ پردیسی کے نام سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔یہی پریم ناتھ پردیسی اپنے افسانوں کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگار قرار پایا۔پردیسی نے نہ صرف اس استحصال کے خلاف لکھنا شروع کیا، بلکہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن بھی تشکیل دی،جس کا نام حلقہ ارباب ذوق رکھا جو اُس صدی کے چوتھے دہے کے

شروع میں عمل میں لائی۔ اس انجمن کا کوئی تعلق اُس حلقہ ارباب ذوق سے نہ تھا جس کے بانی نصیر احمد جامی اور اُن کے رفقا تھے بلکہ دونوں کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کشمیر کے نوجوان ادیبوں کا یہ حلقہ پریم ناتھ پردیسی کے مکان تک ہی محدود رہا، اس انجمن میں شامل پریم ناتھ پشپ، پریم ناتھ در، قیصر قلندر، سوم ناتھ زتشی، مرزا عارف بیگ وغیرہ تھے جو اس انجمن میں کہانیاں اور شعر سنایا کرتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور انجمن کا شیرازہ بکھر گیا۔ کچھ عرصہ بعد راما نند ساگر جن کا وطن کشمیر تھا، پردیسی کے قریب آئے اور پردیسی کو ترقی پسند تحریک کی شاخ کھولنے پر آمادہ کیا۔ پردیسی اور راما نند ساگر نے ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کو منظّم کرنے میں وہی مساعی کی جو سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے ہندوستان کے باقی حصوں میں کی تھی۔ آہستہ آہستہ اس تحریک کا اثر بڑھتا گیا۔ بیرون ریاست سے آنے والے ترقی پسند شعراء اور ادبا نے اس انجمن میں شریک ہو کر نوجوان فنکاروں کی حوصلہ آفزائی کی جس سے اس تحریک کو کافی فروغ ہوا۔ نورشاہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کشمیر میں بنیاد پڑنے اور ادیبوں و شاعروں کا اس تحریک سے جوڑنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وادی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۴۶ء میں رکھی گئی۔ اس میں اردو میں لکھنے والے کم و بیش سبھی ادیب اور شاعر شامل ہوئے۔ اس انجمن کی کارکردگیوں میں ایک اہم سرگرمی اس کی ہفتہ وار مجلسوں کا انعقاد تھا، جو ہر جمعہ ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں چھوٹے بڑے سبھی ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے جن پر جوش وخروش اور دیانت داری سے بحث ہوا کرتی تھی۔'' [۱]

ان تمام محفلوں کی بدولت ریاست جموں وکشمیر میں اس تحریک نے ایک ہمہ گیر ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جس سے بنیادی مسائل پر غور وفکر ہونے لگا۔ جن کا ذکر انجمن ترقی پسند مصنفین کے

پہلے اعلان نامے میں ہوا تھا۔اس طرح یہ تحریک پروان چڑھی اور ہندوستان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب بھی اس تحریک میں شامل ہوئے۔جن میں بیدی،خواجہ احمد عباس اور دیویندر سیتارتھی وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔فکشن کے حوالے سے خاص طور پر پریم ناتھ پردیسی،اور رامانند ساگر کے علاوہ ٹھاکر پونچھی،کشمیری لال ذاکر،علی محمد لون،موہن یاور وغیرہ نے اُس دور کے ڈوگرہ شاہی استحصال کو موضوع بنا کر اردو فکشن میں جان ڈالی۔شاعری میں پردیسی کے علاوہ پیر عبدﷲ،غلام رسول رئیزؔ،نور محمد موتی لال مصریؔ،پرواںؔ ناتھ جلالیؔ اور ماسٹر زندہ کولؔ وغیرہ نے اُس دور کے سماجی و سیاسی،اقتصادی حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ترقی پسند تحریک کی بے حد خدمت کی،جس سے اس تحریک کو فروغ ملا اور بڑے بڑے ادیب اور شاعر اُبھر کر سامنے آئے۔یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی تحریک رہی ہے۔اس تحریک نے ریاست جموں وکشمیر میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کی جس نے کشمیری ادبیات ہی نہیں بلکہ ڈوگری،اور لداخی ادب کی بھی نئی سمتیں متعین کیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب ریاست ڈوگرہ تانا شاہی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔جاگیرداری نظام کی صعوبتوں نے زندگی بے کف کر رکھی تھی۔غربت،افلاس،پسماندگی،معاشی،اقتصادی،بدحالی،طبقاتی کشمکش اور بیکاری کی لعنت جاگیردارانہ نظام کی دین تھی۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے پہلے دور کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی،پریم ناتھ در،رامانند ساگر،کشمیری لال ذاکر،نرسنگھ داس نرگس،ٹھاکر پونچھی،گنگادھر بھٹ،اور کوثر وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور آخر تک لکھتے رہے۔ان افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری میں حقیقت پسندی اور رومانیت کا دلکش انداز ملتا ہے۔جس

طرح پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار مانا جاتا ہے، اُسی طرح پنڈت پریم ناتھ پردیسی کو بھی ریاست جموں وکشمیر کا پہلا اردو افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھانے میں ان افسانہ نگاروں کا کافی اہم رول رہا ہے۔

ا۔ پریم ناتھ پردیسی

پریم ناتھ پردیسی ریاست جموں وکشمیر کے صفِ اول ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۳۶ء سے لکھنا شروع کیا تھا شروع شروع میں یلدرم سے متاثر تھے۔ لیکن بعد میں راہِ حقیقت کی طرف متوجہ ہوکر رومان پسندی کو چھوڑ کر اپنا رُخ بدل دیا۔ ان کی حقیقت پسندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اسداللہ وانی لکھتے ہیں:

> ’’پریم ناتھ پردیسی ابتدا میں ادب برائے ادب کے نقیب تھے مگر جب پریم چند کی کہانی کفن اور ترقی پسند مصنفین کا مشترکہ مجموعہ انگارے چھپا اور اس کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ قیام بھی عمل میں آیا تو پردیسی کو یہ احساس شدت کے ساتھ ہوا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ اس سے انہوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت، روایت اور تصور پرستی کے خیالات کو ترک کر کے خارجی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔‘‘ ۲

پریم ناتھ پردیسی کی کوششوں سے ہی ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے ظلم وستم، سیاسی وسماجی، معاشی، جہالت اور افلاس کو موضوع بنایا۔ اُنھیں اس بات کا بڑا احساس تھا کہ جو لوگ یہاں پر گھومنے آتے ہیں۔ وہ صرف یہاں کی

خوبصورتی کو ہی نہ دیکھیں بلکہ یہاں کی غربت اور افلاس میں ڈوبے لوگ کس طرح سے اپنی زندگی بسر کر تے ہیں اُس کو بھی سمجھیں۔ان کی افسانہ نگاری پر غلام محمد صادق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خود پردیسی کو باہر کے افسانہ نگاروں سے سخت شکایت تھی ،جنہوں نے کشمیر کے قدرتی اور خوبصورت مناظر سے متاثر ہوکر تخیلی اور رومانی خاکے کھینچے جن کا خاکہ یہاں کی زندگی اور یہاں کے خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔جنہوں نے جنت کو تو دیکھا لیکن جہنم کی آگ میں دہکتی ہوئی زندگی کو نظر انداز کیا۔'' ۳۲

پریم ناتھ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے''شام وسحر''،''دنیا ہماری''اور'' بہتے چراغ''ہیں۔ افسانوی مجموعہ'' بہتے چراغ''اُن کی موت کے بعد شائع ہوا۔یہ دراصل اُن کے تین غیر مطبوعہ مجموعوں کا انتخاب ہے۔اس مجموعے کے افسانے ایک بیدار مغز حساس اور باشعور کہانی کار کا احساس دلاتے ہیں ۔جس کی بدولت پردیسی ہندوستان کے ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنا چکے تھے اور ترقی پسند تحریک کے فوراً بعد آنے والے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگے۔سید احتشام حسین نے اُن کا مقام متعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پردیسی کا شعور اُس کشمیر میں جوان ہوا۔ جو قومی آزادی کی جدو جہد میں مصروف تھا اور عوامی بیداری نے گردوپیش کے ماحول پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔اس ماحول کو فطرت نے حسین وجمیل بنایا تھا۔لیکن انسان اس کو گھنا وَنا بنا رہا تھا۔کشمیر کے متعلق جو شخص بھی لکھے گا اُس کا اِس زبردست کشمکش کو محسوس کرنا لازمی ہے،ورنہ وہ کشمیر کی روح میں نہیں اُتر سکے گا۔ پردیسی کے

افسانوں میں اس کشمکش کا شعور نظر آتا ہے۔'' [۴۴]

افسانوی مجموعہ'' بہتے چراغ''میں کشمیر کے سچے ترجمان کی روح نظر آتی ہے۔اس مجموعے میں اُن بدنصیب، دردمند لوگوں کے دل دھڑکتے نظر آتے ہیں جو جنت کشمیر کے دوزخ بھرے ماحول میں صدیوں سے رہتے آئے ہیں۔جس طرح پریم چند نے اپنے دور کی آخری تحریروں میں ہندوستانی کسانوں کو زبان بخشی ہے اُسی طرح پریم ناتھ پردیسی نے بھی ان کہانیوں میں کشمیر کی اصل روح کو منظر عام پر لایا ہے۔اُنھوں نے فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ کشمیریوں کی تکلیف اور مسائل، اُن کے اصلی مزاج اور تیور، اُن کی سادگی اور شرافت، اُن کے عادات اور خصائص، اُن کی مظلومیت اور احساسِ بغاوت کی عکاسی پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ کی ہے۔

اُس دور میں لکھے گئے پردیسی کے کئی نمائندہ افسانے ہیں۔جن کے موضوعات صرف کشمیر سے متعلق ہیں۔ان افسانوں میں کشمیریوں کا دُکھ درد، ارمانوں اور ولولوں اور ان کے ظاہر باطن کو حقیقت آمیزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جیسے، کتبے، کاغذ کی جھنڈیاں، جواری، خون اور سکے، جہاں سرحد ملتی ہے، جھنجھنا، بہتے چراغ، کاریگر، ڈھول، اگلے سال، دیوتا کہاں ہیں اور سیلز مین یہ سب اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔

اُس دور کا ایک نمائندہ افسانہ'' جھنجھنا'' ہے۔جو کشمیری پنڈتوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔لیکن پردیسی صرف اس پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ جزئیات نگاری میں بھی کمال رکھتے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار'' گنگا دھر'' کی ملاقات شہر سے گاوں لوٹتے ہوئے ایک تانگہ بان سے ہوتی ہے۔جس کے تانگہ پر وہ سفر کرتا ہے پردیسی کا یہ تانگہ بان منٹو کے'' منگو کوچوان'' کی یاد دلاتا ہے۔دونوں آن پڑھ ہیں لیکن دونوں کو مقامی اور ملکی سیاست سے دلچسپی ہے، دونوں اپنی سواریوں کے توسط سے خبریں سن کر اُن پر

تبصرہ کرتے ہیں ۔ جبکہ دونوں عوامی آواز کی علامت ہیں ۔ منگو کوچوان کے دل میں انگریزوں کے لیے نفرت ہے ۔ جبکہ پردیسی کے تانگہ بان کو شخصی راج سے ۔ منگو کوچوان ایک گورے کو بیٹھا کر کہتا ہے:

’’پہلی اپریل کو بھی وہ ہی اکڑ خوں ۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچہ۔‘‘ (نیا قانون)

اور پردیسی کا تانگہ بان گنگا دھر سے کہتا ہے:

’’ہم مسکین ضرور ہیں مگر دولت کون پیدا کرتا ہے ۔ اناج کون اُگاتا ہے ۔ ریشم اور پشمینہ کون بُنتا ہے ۔ اس پر ہم بھوکوں مریں، گالیاں کھائیں ۔۔۔ پنڈت تم بزدل ہو ۔ مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے ہمیں پیٹ بھر کر روٹی ملنی چاہیئے ۔‘‘

۵

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تانگہ بان کی گفتگو میں ایک باغی کی روح تڑپتی ہے ۔ بالکل منگو کوچوان کی طرح ان کے افسانے سیلز مین، کاریگر، سنکرات، خون اور سکے، اُسی استحصال کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پردیسی کو اس طرح کی کہانیاں بُننے اور کہنے کا فن بہ خوبی آتا ہے ۔

اسی طرح پردیسی کا ایک اور افسانہ ’’جنت اور جہنم‘‘ ہے ۔ جس میں پردیسی یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح سے ہمارے لوگ روزی روٹی کمانے کے لیے بیرون ریاست جانے پر مجبور تھے ۔ اس افسانے میں جاگیر دار اور مہاجنی نظام کے پس منظر کو بے نقاب کیا گیا ۔ اس سے کشمیر کی اصل حالت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ۔ کچھ کشمیری مزدور روزی روٹی کی تلاش کے لیے پیدل چل کر دہلی آتے ہیں ۔ ایک جگہ ایک کردار کہتا ہے:

’’بخدا کشمیر دوزخ ہے، دوزخ اب دیکھو گے دلی کیا ہے ۔

کتنا بڑا شہر ہے ہر طرف دولت ہی دولت ہے۔'' ۶

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مزدور لوگ کس طرح سے مہاجنی دور اور سرمایہ داروں سے بیزار تھے۔ بلکہ یہ کشمیر کے متوسط اور نچلے طبقے کی آواز ہے جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اس افسانے کا اختتام بھی پردیسی نے بڑی ہُنر مندی سے کیا ہے اور منظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ کرداروں کے نفسیات کو بھی پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''فسٹ کلاس ڈبے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی لاٹھی لٹاتا ہوا نکلا محصول خانے کے افسر نے اسے سلام کیا اور اس کے ساتھ ہی درجن بھر وردی پوس چپراسیوں نے سلیوٹ کیا۔۔۔۔۔افسر نے آہستہ سے مسکرا دیا اور ادھر اُدھر دیکھ کر محصول خانے کے افسر سے کہا! کشمیر واقعی جنت ہے۔'' ۷

اس اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف سے سرکاری افسر جنت کشمیر میں اپنی نوکری کرنے کے لیے پندرہ سو روپیہ مہینہ لینے کے لیے آرہے تھے اور دوسری طرف پیدل راستے سے درجنوں بھر کشمیری مزدور پیٹھ پر بوجھ اُٹھائے دوزخ سے جا رہے تھے۔

اس طرح پردیسی نے بہت سے افسانے لکھے جن میں حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کا امتزاج ملتا ہے۔ جس سے ان کی ترقی پسندی کا اندازہ ہوتا ہے اور حق وصداقت کا علم بلند کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ پریم ناتھ درؔ

اُس دور کے ایک اور اہم افسانہ نگار پریم ناتھ درؔ ہیں۔ پریم ناتھ درؔ کا تعلق کشمیر سے تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گئے تھے۔ جہاں وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے۔ اُس عہد کے ادیبوں اور

شاعروں میں علامہ اقبالؔ، ظفر علی خان اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی صحبت سے درؔ نے استفادہ کیا اور سیاست میں بھی عملی حصہ لینے لگے۔ اُنھوں نے کارل مارکس اور لنین کی تحریروں کا بہت ہی دلچسپی سے مطالعہ کیا اور متاثر بھی ہوئے۔ کشمیر میں اس وقت شیخ محمد عبداللہ شخصی حکومت کے خلاف عام لوگوں کی قیادت کر رہے تھے۔ حکومت نے اس تحریک کو چلانے والوں کے خلاف جو رویہ اختیار کیا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے قائدین لاہور چلے گئے تھے۔ ان مشکل تر حالتوں میں درؔ نیشنل کانفرنس کے ایک پروگرام کے رُکن بن گئے لیکن گورنمنٹ کی پوچھ تاچھ اور گرفتاری کے ڈر سے لاہور چلے گئے۔ وہاں جا کر بھی آزادی کا یہ پروپا گنڈا جاری رکھا۔

پریم ناتھ درؔ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''غلط فہمی'' جریدہ ''ادبی دنیا'' لاہور سے شائع ہوا۔ ادبی دنیا کے مدیر مولانا صلاح الدین اس کہانی کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پریم ناتھ درؔ ہمارے افسانوی اُفق پر طلوح ہوتے ہی چمک اُٹھا ہے۔ وہ ہمارے موجودہ ستاروں کو بھی آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا۔۔۔ میں نے درؔ کے بارے میں پہلے بھی جو پیش گوئی کی تھے وہ صحیح ثابت ہوگی۔ کہاں ہیں وہ افسانہ نگار جو کہتے ہیں کہ انہوں نے عظیم افسانے لکھے ہیں۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ افسانے یہ ہوتے ہیں۔ چائے کی پیالی کو داخلیت اور نفسی تجربہ کا معیار سمجھنے والے یہ جان لیں کہ اس معیار کے حدود ابھی اور آگے ہیں۔'' ۸؎

شمیم احمد شمیم پریم ناتھ درؔ کے افسانوں کی زبان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پریم ناتھ درؔ کے موضوع سے قطع نظر ان کی زبان کے برتاؤ پر بڑا ہی رشک آتا

ہے۔ یہ شخص اردو زبان کو اتنی مشتاقی اور چابکدستی سے استعمال کرتا ہے کہ خود اہل زبان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔''۹

پریم ناتھ درؔ کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں پہلا افسانوی مجموعہ ''کاغذ کا واسدیو'' جو حلقہ ارباب ذوق دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس میں کل (۹) افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں انہوں نے کشمیر کی سماجی زندگی کی اچھی طرح عکاسی کی ہے۔ درؔ نے اسی زمانے میں حلقہ ارباب ذوق کی محفلیں دہلی میں سجائیں، پروفیسر جگن ناتھ آزاد درؔ کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کر ہندوستان آ گئے تو دہلی میں جو سب سے پہلی ادبی مجلس جمی وہ پریم ناتھ درؔ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی درؔ کے گہرے دوست تھے۔ دونوں نے مل کر حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ اس کی مجلسوں میں اردو کے نامور ادیب شرکت کرتے تھے جن میں ظہور الدین، شیر محمد اخترؔ، خورشید الحسن، محمد حسن عسکری، اعجاز بٹالوی، غلام عباس، رفیق خاور، تابش دہلوی، عبادت بریلوی، ن م راشد، جوشؔ، اشکؔ اور شاہد احمد دہلوی شامل تھے۔'' ۱۰

''نیلی آنکھیں'' درؔ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل دس (۱۰) کہانیاں شامل ہیں۔ درؔ فرائڈ سے متاثر تھے بعض کہانیوں کی تکنیک بالکل انوکھی تھی جیسے ''دودھ'' میں شعور کی روح کا تجربہ کیا گیا ہے۔ درؔ نے ان کہانیوں میں کشمیر کے لوگوں کی بے بسی کے ساتھ ساتھ وجوہات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جنہوں نے کشمیری عوام کو بھوک اور افلاس کی طرف دھکیل

دیا ہے۔ پردیسی کے ساتھ جس افسانہ نگار نے کشمیریت کا احساس دلایا۔ اُن میں دؔر کا نام پہلے آتا ہے۔ دؔر نے بھی پردیسی کی طرح کشمیر کی جنت کا ذکر بہت کم کیا بلکہ یہاں کے لوگوں پر جاگیردارنہ نظام سے پھیلی بُرائیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ اس پر احتشام حسین اظہار خیال کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''کشمیر جو بار بار اُن کے افسانوں میں آتا ہے۔ اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لیے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوس جگانے کے لیے فضا تیار ہوتی ہے بلکہ اُن میں وہ غم الودہ اور نشتر آگیں کَک بھرتا ہے۔ جس سے ہم کشمیر کی حقیقت سے ذیادہ قریب ہوجاتے ہیں۔'' ۱۱

پریم ناتھ دؔر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''چناروں کے سائے میں'' ان کی وفات کے بعد جی۔ آر۔ حسرت گڑھ نے ترتیب دے کر ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ دؔر کا شمار اردو افسانے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کشمیر سے باہر رہ کر بھی کشمیریت اُن کی رگ رگ میں بسی تھی۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس مجموعے کے پیش کلام میں جی۔ آر۔ حسرت لکھتے ہیں:

''پریم ناتھ دؔر اپنے ثقافتی ورثے کو ساتھ لے کر ہی ترقی پسند تحریک کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ کشمیر کے شاندار ثقافتی ماضی کو میں فراموش نہیں کروں گا جس سے ثقافتی چھاپ برصغیر پر چھائی ہوئی ہے''۔ ۱۲

ریاست جموں وکشمیر میں دؔر کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہی ہوتا ہے اور وہ اس تحریک کے روح رواں بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادھے انداز میں عوام کے مختلف مسائل کو اُبھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثلاً غربت، جہالت، غلامی، طبقاتی کشمکش اور بیکاری وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔

پریم ناتھ درؔ کا ایک مشہور افسانہ ''کوفتہ'' ہے۔کوفتہ گوشت کی ایک قسم ہے جسے ہم کباب بھی کہتے ہیں۔جس کا ذائقہ افسانے کے کردار لالہ گھاسی رام کے بیٹے بابورام کو سبزی خوری سے گوشت خور بنا دیتا ہے۔اس افسانے میں بھی ان کے اور افسانوں کی طرح کشمیر کی زندگی کا حُسن مفاہمیت اور اس کی عظمت کا احساس جھلکتا ہے۔کشمیری پنڈتوں میں ایک بھی فرد ان پڑھ نظر نہیں آتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ لوگ کتنے عجیب و غریب ہیں۔ برہمن پنڈت، خوبصورت، فارسی دان،
انگریزی دان، مہا شاستری، پھر گوشت پسند، یہ لوگ بڑے بڑے ہون کرنے
والے، بڑے بڑے پاٹھ، پھر یہ گوشت اور تو اور رہا یہ لوگ دیوتاؤں کو بھی یہی
چیز چڑھاتے ہیں۔'' ۱۳؎

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح کشمیر کی حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔جیسے کہ ایک غریب آدمی برف کی ٹوکریاں بھر کے اُونچے پہاڑوں سے لاتا ہے اور شہر میں آ کے تاجروں کو سستے داموں میں بیچتا ہے۔اسی طرح اس غریب کا استحصال ہو رہا ہے۔ان تلخ حقیقتوں کو درؔ نے بڑے فنکارانہ انداز میں اپنے افسانوں میں برتا ہے۔

درؔ کا ایک اور افسانہ ''کاغذ کا واسدیو'' ہے جس میں اُنھوں نے ایک غریب کسان کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔یہ غریب کسان اپنے بچوں کی مری ہوئی ماں کی یاد سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی زندگی کو بچوں کے لیے مصروف رکھتا اور اپنے بچوں کو کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دیتا ہے۔ایک دن برف کے ڈھیر کو ہٹاتے ہٹاتے زندگی کی تھکان سے ہار کر واسدیو اپنے بچوں کو ہنساتا ہنساتا اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''نہیں نہیں کا کا۔ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔تم اماں مت بنو کا کا۔اماں مت بنو۔اماں

والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کا کا۔اماں مت بنو کا کا۔'' ۱۴

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی کی وفات کے بعد کس طرح واسدیو نے اپنے بچوں کو پیار دینے میں دو طرفہ حق ادا کیا جس کی اُنہیں سخت ضرورت تھی۔ ڈؔر فرائڈ سے متاثر ہیں۔اس لیے اُنھوں نے جذبات نگاری اور نفسیات کو اپنے افسانوں میں بہ خوبی برتا ہے۔

ڈؔر کا افسانوی ادب میں بڑا نام ہے۔ان کا اندازِ بیان بہت دلکش وشگفتہ ہے۔جس میں ایک بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ساتھ ہی ان کے افسانوں میں معاشی اور طبقاتی کشمکش کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

۳۔کرشن چندر

ریاست جموں وکشمیر میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کرشن چندر جیسے روشن دماغ افسانہ نگار اُبھر کر سامنے آئے۔ کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ان کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت کا غلبہ طاری تھا۔ایک تو ان کا مزاج اور پھر کچھ کشمیر کے رومان پرور ماحول نے انھیں رومانی کہانیاں لکھنے پر مجبور کر دیا۔کچھ عرصے بعد ان کے نظریے میں تبدیلی آئی اور وہ حقیقت نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔''طلسم خیال'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے بیشتر افسانے رومانی ہیں اور کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں یہ بات کافی حد تک صحیح ہے لیکن جہاں تک راقم الحروف نے پڑھ کر کے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس مجموعے میں شامل کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق حقیقت نگاری سے ہے۔کرشن چندر کی حقیقت نگاری ''طلسم خیال'' کے ان افسانوں میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے جن کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ وہ رومانی افسانے ہیں۔ان کی حقیقت نگاری کے بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''کرشن چندر نے اردو افسانہ نگاری میں جو رنگ پیدا کیا ہے، وہ بالکل نئی چیز ہے ۔۔۔اس کے افسانوں میں ہمیں رومان و حقیقت کا امتزاج ملتا ہے جو ہندوستانیوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔لیکن وقت اور ماحول کے تقاضوں نے ان کو حقیقت پرست اور واقفیت پسند بنا دیا ہے۔وہ اپنے انفرادی اور شخصی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔'' ۱۵

اس بات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر کے کچھ رومانی افسانوں کو چھوڑ کر بیشتر میں رومانیت کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقتیں بھی پس منظر سے جھانکنے لگتی ہیں۔کرشن چندر رومانیت اور حقیقت کو اس طرح ایک دوسرے میں ضم کر دیتے ہیں کہ دونوں ہی اہم دکھائی دینے لگتی ہیں۔کہانی میں دکھایا جانے والا رومان اس کے افراد اور ان افراد کا طرزِ عمل تینوں ہی حقیقت کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں۔

رومان کا سہارا لے کر کرشن چندر جس طرح حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں وہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ورنہ عورت کی محبت کا والہانہ انداز میں ذکر ہو اور اُس میں تلذذ پیدا نہ ہو یہ بہت مشکل ہے۔کرشن چندر نے اس مشکل کو بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے آسان کر دکھایا اور معاشرے میں چھائی ہوئی گھٹن ، لاچاری اور کشمکش کو فنی خوبیوں کے ساتھ تخلیقات میں پیش کرنا شروع کیا ہے۔انھوں نے اپنے فن کے ذریعے لاچاروں، مجبوروں اور مظلوموں کو بیدار کرنے کا کام کیا ہے۔

ان کے افسانوی مجموعے ''طلسم خیال'' میں شامل افسانہ ''اندھا چھتر پتی'' جس میں انھوں نے ایک کردار (چھتر پتی) کی روحانی جذبے سے لبریز محبت دکھائی اور وہیں حقیقت سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔چھتر پتی جب شہر سے کمائی کر کے واپس گاؤں لوٹتا ہے تو لوگ اس کی خوب خاطر داری کرتے ہیں۔جو پہلے اس سے اپنی خدمت کرواتے تھے وہ اب اس کی تعریف کر کے اس کو لوٹ رہے ہیں اس

افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس عرصے میں اس کی کئی ایک خلائیں، پھوپیاں اور چچیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بات یہ تھے کہ چھتر پتی دو تین سو روپیہ پردیس سے کما کر لایا تھا اور پھر اس کے پاس کپڑوں اور دیگر اشیا سے بھرے ہوئے تین چار ٹرنک بھی تھے اور ایک نہایت ہی خوبصورت بسترا،۔۔۔ایسا خوبصورت بسترا تو نمبر دار کے گھر پر بھی موجود نہ تھا۔ وہ ہی گاؤں کے بوڑھے برہمن جنہوں نے اسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا۔اب وہی فرطِ محبت سے اس کے سر پر بار بار ہاتھ پھیرتے تھے اور اسے دیکھ کر نہال ہوتے جاتے تھے۔'' [۱۶]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مفلسی میں انسان کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔لیکن جب اس مفلس انسان کے پاس دولت آجاتی ہے تو دور کے رشتے بھی اپنے بن جاتے ہیں اور اس سے محبت جتانے لگتے ہیں۔

''طلسم خیال'' مجموعے میں شامل ان کا ایک اور مشہور افسانہ ''صرف ایک آنہ'' میں ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کی تصویر کشی کی گئی ہے جو روزگار کی تلاش میں دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنی قابلیت اور معیار سے نیچے اُترتے ہوئے بھیک مانگنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سروش (کردار) خود کو ذہنی طور پر بھیک مانگنے کے لیے تیار کرتا ہے اور بھکاریوں کے ایک سردار کے پاس جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی دردناک ہوتا ہے۔افسانے کا یہ نوجوان کردار (سروش) جس ذہنی اور جذباتی کیفیت سے گذرتا ہے وہ نہایت ہی تکلیف دہ ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''منگو، بھکاریوں کا سردار لاتیں پھیلائے چٹائی پر حقہ پی رہا تھا۔۔۔اس نے

سروش کو کھلے گلے اور لمبے کالروں والی ملگجی قمیض دی اور نیلی سرج کا کوٹ جس پر تیل کے بڑے بڑے دھبے تھے اور ایک گرے فالین کی پتلون اور ایک چمڑے کا بیگ۔ 'یہ لو بیٹا'۔ منگو نے کہا۔ 'ان کپڑوں کو پہن لو'۔

سروش چٹائی پر بیٹھ کر انھیں پہننے لگا، بہت پرانے بوٹ تھے سوکھا ہوا چمڑا کرم خوردہ بے رنگ و بدزیب۔ یکا یک سروش کی نگاہیں ایک سبز لیبل پر پڑیں جو بوٹ کے اندر لگا ہوا تھا۔ سروش کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں برچھی بھونک دی ہو۔ یہ ایٹونیا مارکہ بوٹ تھا۔ وہی پرانا سبز لیبل۔ ان ہی بوٹوں کو وہ ہمیشہ کالج کے دنوں میں جانسن اینڈ کمپنی کی دوکان سے خریدا کرتا تھا۔ ۔۔۔یکا یک اس کا گلہ بند ہونے لگا۔ کوئی غیر مرئی طاقت اپنے آہنی ہاتھوں سے اس کے گلے کو دبا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اس وقت نہ بول سکا تو پھر شاید ہمیشہ کے لیے چپ ہو جائے گا۔ مر جائے گا۔ اس نے بازوؤں سے ہوا میں کسی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے مُنہ کھول کر ہوا کے ایک دو گھونٹ نیچے اُتار لینے کی کوشش کی۔ اس نے بولنا چاہا اور پھر یکا یک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ایک بلند وحشیانہ ہنسی اس کے لبوں سے پھوٹ نکلی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بند بند ہنسی سے کانپ رہا تھا۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر کے اس افسانے میں محض ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری ہی نہیں دکھائی دیتی بلکہ اس کے نتیجے میں حالات کے آگے جھک کر جس طرح وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہوا، اس کا بیان بھی ملتا ہے اور ساتھ ہی اس کی ذہنی اور دلی کیفیت کی تصویر کشی بھی کی گئی

ہے۔ یہ کہانی سرمایہ دارنظام پر طنز ہے اوران کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔

کرشن چندر نے افسانوی مجموعے ''طلسم خیال'' میں شامل افسانہ ''گوماں'' میں رشوت خوری کو موضوع بنایا ہے اس موضوع کے ذریعے معاشرے میں جو برائیاں قائم ہیں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تھانیدار صاحب نے حرص کے وقت دانت تیز کئے ہوئے تھے۔ تین سو سے ایک پائی کم لینے کو تیار نہ تھے۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ اسی حیص بیص میں کئی دن گزر گئے۔ آخر ایک دن تھانیدار صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے کیوں بھائی پھر کیا صلاح ہے، چلان کردوں، آخر کب تک چپ بیٹھا رہوں گا، نورحسن بھی بگڑا ہوا ہے۔ فرض کے بجا آوری تم جانتے ہو'
>
> قرأت سے معلوم ہوتا تھا کہ نورحسن نے آج تھانیدار صاحب کی مٹھی گرم کی تھی۔ فرض کی بجاحکم آوری اتنے دن خاموش رہنے کے بعد آج پھر چمک اٹھی تھی۔ کوئی جواب نہ پا کر تھانیدار صاحب اٹھ کھڑے، اچھا تو چلتا ہوں، اگر آج شام تک کچھ بن جائے تو بہتر، ورنہ کل تو معاملہ میرے اختیار سے باہر ہو جائے گا۔'' ۱۸؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر نے بڑے فنکارانہ انداز میں اس تلخ حقیقت سے پردہ ہٹایا ہے کہ اگر پنڈت جی رشوت دے دیں تو اپنی سزا سے بچ سکتے ہیں مگر یہاں کرشن چندر نے مرکزی کردار کے ذریعے رشوت نہ دلوا کر یہ سبق دیا ہے کہ اگر عوام سچائی کا ساتھ دے تو اس طرح کی غلاظتوں کو ہمارے معاشرے سے ختم کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح کرشن چندر کے افسانوی مجموعے میں شامل اور بھی ایسے افسانے ہیں جیسے ''مجھے کتے نے کاٹا''، ''تالاب کی حسینہ''، ''ممتا'' اور ''قبر'' وغیرہ حقیقت نگاری کی عکاسی کرتے ہیں۔ کرشن چندر نے نہ صرف حقیقت نگاری کے دور میں لکھی تحریروں کے ذریعے معاشرے میں پنپنے والی برائیوں سے عوام کو آگاہ کیا ہے بلکہ رومانی دور میں بھی کرشن چندر کے افسانوں میں حقیقت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ حقیقت صرف وہی نہیں ہے۔ جو ہمیں کھلی آنکھوں سے نظر آتی ہے بلکہ وہ بھی ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ انسان کی زندگی میں جہاں ایک جانب اس کی مادی ضرورتیں ہیں وہیں دوسری جانب روح اور جسم کی ضرورتیں بھی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کرشن چندر نے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور سماج میں آئے اُتار چڑھاؤ کے متعلق جتنا غور وفکر کیا ہے وہ کم ہی ادیبوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ بھوک، بے روزگاری، کمزوروں کا استحصال، سرمایہ داروں کی بے ایمانی اور لوٹ کھسوٹ کا کرشن چندر مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر انھیں اپنی تحریروں میں جگہ دے کر عوام کی توجہ اس جانب کرانے کے ساتھ انھیں بیدار کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کرشن چندر نے موضوع سے انصاف کے ساتھ ساتھ فنی منصب سے کبھی کوتاہی نہیں برتی بلکہ فن اور حقیقت دونوں کا احترام ملحوظ رکھ کر کہانیاں تحریر کیں۔ کرشن چندر کی حقیقت نگاری خواہ سفاک صورت اختیار کرے یا ایک لطیف اشارہ کرے ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کرتی ہے کرشن چندر حقیقت نگاری کے متعلق ''کہانی کی کہانی'' میں لکھتے ہیں:

> ''کہیں کسی بچے نے میری کہانی نہیں سنی، وہ سب پریشان ہو چکے ہیں۔۔۔۔
> بوڑھے ہوتے جارہے ہیں اور اُن کی ہنسی کمہلائے پھولوں کی طرح مُرجھا کر
> فرش خاک پر گر چکی ہے۔ میں اب اس ہنسی کے لیے لڑنا چاہتا ہوں۔ میں مسخرہ

نہیں بننا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے موٹی سے کارتوس کی گولی بنادواور وہاں

بھیج دو جہاں انسان انسان پر ظلم کے خلاف لڑ رہا ہے۔'' ۱۹

کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں عام انسانی محرومیوں، دکھوں اور تکلیفوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ تمام دکھ اور تکلیفیں ان کی ذات کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ کرشن چندر نے اپنے گردوپیش پر محض تنقیدی نظر ہی نہیں ڈالی بلکہ کچھ جگہوں پر مسائل کے حل بھی پیش کیے ہیں۔ اُنھوں نے ''طلسم خیال'' مجموعے میں رومان کا سہارا لے کر جس طرح حقیقت کا ادراک کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

۴۔ کشمیر لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے افسانہ نگار تھے۔ جنہوں نے کشمیر میں رہ کر ترقی پسند تحریک اور کشمیر کی آزادی کے حوالے سے شاید سب سے زیادہ افسانے لکھے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کے لاشعور میں ہمیشہ کشمیر بسا رہا ہے۔ شروع شروع میں وہ شعر کہتے تھے۔ لیکن شاعر سے زیادہ فکشن رائیٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اُنہوں نے نثر کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی۔ چناچہ اُن کا پہلا افسانہ ''الگ الگ راستے'' ''ہمایوں'' لاہور سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی کہانیوں کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۹۵۰ء میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''جب کشمیر جل رہا تھا'' شائع ہوا۔ اس مجموعے کی لگ بھگ سبھی کہانیاں قبائلی حملے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد ذاکر کے افسانوں کے متعدد مجموعے منظر عام میں آتے گئے جن میں ''یہ کھنڈر میرے ہیں'' اس کے علاوہ تین کہانیاں ''چراغ کی لو''، ''اُداس شام کے آخری لمحے''، بیریوں والا فقیر'' اور ''ایک کرن روشنی کی'' وغیرہ کشمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کے افسانوں میں کشمیر کے لوگوں کی زندگی کے مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی

ہے کہ اُس وقت کشمیر کے لوگ ڈوگرہ استحصالی نظام میں کس طرح اپنی زندگی، مفلسی اور غربت میں گذار رہے تھے۔ ان کی کہانیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے برج پریمی لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر ذاکر اس معاشرے میں انسان کی بے بسی بے کلی کی کہانیاں رقم کرتے ہیں اور انسان کو اُس کی کلی حیثیت میں اُس کے مسائل کے ساتھ مطالعہ کر کے اُس کو کہانیوں کا پیکر دیتے ہیں چاہے وہ افسانے ہو یا ناول۔ وہ ڈوگرہ استحصالی نظام کی پیدوار ہیں۔ اس لیے شروع سے ہی اس استحصال کے خلاف اُن کے دل میں ایک آگ دہک رہی ہے۔ اپنے ادب میں اس استحصال کی اُنھوں نے دھجیاں اُڑا دی ہیں۔'' [۲۰]

ترقی پسند تحریک ابھی عروج پر ہی تھی کہ اُس وقت تقسیم ہند کا سانحہ رونما ہوا۔ تقسیم ہند صرف ملک کو الگ نہیں کر گئی بلکہ اکثر دلوں کو چیر گئی۔ اس سے ہجرت اور اتنے فساد شروع ہو گئے کہ جو لوگ ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہتے تھے وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، یعنی اُس وقت خون کی ہولی کا اس طرح بے پردہ ناچ ہوا کہ اُس کو یاد کر کے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اسی طرح ذاکر کو بھی ان حادثوں نے بہت متاثر کیا اور ان وارداتوں کو اُنھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جب کشمیر جل رہا تھا'' جو کہ ۱۹۵۰ء میں لاہور ''ہمایوں'' سے شائع ہوا۔ اس کے لگ بھگ سبھی افسانے اسی قبیل کے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کے دیباچہ میں بلونت سنگھ لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر ذاکر کا نقطہ نظر وہی ہے جو ہند یونین کے ایک ایک ادیب کا ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ لیکن جو نتائج پیش کے گئے ہیں وہ کسی خاص مذہب، فرقے یا جماعت کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ ان فسادات میں مظلوم نہ

مسلمان تھے نہ ہندو اور نہ سکھ اگر کوئی مظلوم تھا تو وہ تھی انسانیت۔'' ۲۱

اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ'' آج کی رات''،جس میں ہندوستان کی تاریک ترین دور کا ایک ورق ہے۔ جسے بُھولنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔اپنی سرزمین کے خاطر جان دینے والا ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو غدر کی رات ایک خط لکھتا ہے جس کی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب تین برس کے بعد تم نے میری خیرت کے متعلق پوچھا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے تم نے موت کے تیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے ایک فولادی ڈھال دے دی ہے۔تمہاری زندگی کو میری زندگی سے زیادہ خطرہ ہے۔

'' ۲۲

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح دو جواں دِل ،صورت اور زندگی کی کشمکش سے ڈری ہوئی فضا میں ایک ہی تال پر دھڑ کتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں وہ اس اقتباس سے ملاحظہ کیجیے:

یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی شاید اب کبھی زمین تک پہنچے گی نہیں آج کی رات ہمارے ملک کے لیے کتنی اہم رات ہے اس رات کے اندھیرے میں ہمارا مستقبل سانس لے رہا ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کشمیری لال ذاکر کے افسانوں میں حقیقت کا رس بھرپور ہے اور وہ ان تلخ سچائیوں کو لفظوں کا جامع پہنا کر پیش کرتے ہیں۔

فسادات سے متاثر ہو کر بھی کشمیری لال ذاکر نے کئی افسانے لکھے ہیں۔جیسے کہ ان کا افسانہ'' اُفق'' بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو ایک ہندو خاندان کی کہانی ہے۔جس میں ایک غریب اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر پیسے کمانے کے لیے کشمیر سے دہلی کا رُخ کرتا ہے اور واپسی پر جو منظر دیکھتا ہے وہ

نہایت ہی دردناک ہے مگر سیدھے سادے انداز میں اس کہانی کا عروج قابلِ تعریف ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''رام ناتھ کے چلے جانے کے بعد شیلا دیر تک خلا میں گھورتی رہی ایک خلا جس میں نجی زندگی کی یادیں اور بدلتے ہوئے ماحول کے خاکے تیر رہے تھے۔'' ۲۳

اور آخر کار جب میاں اور بیوی بے بس اور پاگل پن کا شکار ہو کر ہسپتال میں مر جاتے ہیں اور آخری بار اپنی نظریں ملاتے ہیں:

''لب خاموش تھے لیکن دماغ چیخ رہا تھا'' ۲۴

اور پھر موت کی تھکن، اکیلا پن اور خاموشی ان کی نگاہوں میں تھی۔ روتی اور مایوس زندگی کا اس سے بہتر منظر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ والدین کی موت کے بعد ان کا لڑکا (روی) بھی بستر پر پڑے ہوئے اپنے ماں باپ کی لاشیں دیکھ رہا تھا۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''جنہوں نے اس کی زندگی سے اچانک اپنا خشک سایا ہٹا کر اُسے یتیمی کے تپتے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا اور اس کی معصوم شفاف اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ایک اُفق لرز رہا تھا۔ ایک ایسا اُفق جو خون کے داغوں، خنجر کی دھاروں اور آگ کے شعلوں سے روشن تھا۔'' ۲۴

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ ''اُفق'' سادگی اور پرکاری کا ایک دلکش نمونہ ہے اور مرکزی نقطہ نظر اور شدت تاثر کے لحاظ سے یہ ایک ممتاز کہانی ہے۔ ذاکر بالکل عینی شاہد کی طرح کہانی کے تانے بانے بُنتے اور واقعات کی کڑیاں جوڑتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کا ایک اور افسانہ ''منزل منزل'' ہے جس میں اُنہوں نے ایک عورت کی

زندگی کو پیش کیا ہے جو سب کچھ ہونے کے باوجود بھی زندگی سے ناخوش معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک عیب وغریب گھٹن محسوس کرتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرا خاوند ایک اچھی اور مشہور فرانیسی انشورنس کمپنی کا ایجینٹ ہے۔ آمدانی معقول ہے اور گھریلو حالات خوشگوار ہیں لیکن پھر بھی اپنی طبیعت میں گھٹن پاتی ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالات کی مضبوط زنجیروں نے میرے دل و دماغ کو پوری طرح جکڑ رکھا ہے۔'' ۲۵

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر نے اس افسانے میں تحلیل نفسی سے کام لیا ہے اور ایک عورت کی سرگذشت کو فنکارانہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذاکر کے افسانے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آج کے حالات کی عکاسی کر رہے ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے یہ افسانہ بہت پہلے لکھا ہے لیکن یہ افسانہ عصر حاضر کے حالات کی ترجمانی کرتے نظر آتا ہے۔ کشمیری لال ذاکر یقینی طور پر اردو کے ایک ایسے معمار ہیں جنہوں نے نہ صرف ریاست میں بلکہ ریاست سے باہر بھی اس زبان کی تعمیر وترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

۵۔ علی محمد لون

کشمیر کے افسانہ نگاروں میں علی محمد لون بھی اہمیت رکھتا ہے۔ جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''بچے'' ماہنامہ ''آج کل'' میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ریڈیو کشمیر میں ملازمت کے دوران لون نے ان گنت افسانے لکھے اور اپنی ایک الگ شناخت بنائی۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

علی محمد لون کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر سچی اور تلخ بات مُنہ پر کہنے میں یقین رکھتے تھے

۔ان کی اسی بے باکی کی وجہ سے ہر کوئی ان کا احترام کرتا تھا۔لون نے افسانوں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے۔ان کا مشہور سٹیج ڈراما ''سِیَا'' ہے۔اس کے علاوہ ریڈیو سے بھی ان کے بہت سارے ڈرامے نشر ہوئے۔ان کے تحریر کردہ دو مضامین ''ماسٹر جی حیات وافکار'' اور کشمیری زبان میں ''بچوں کا ادب'' آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

علی محمد لون نے کشمیری میں ایک ناول ''اَس تہٕ چُھ اِنسان'' (ہم بھی انسان ہیں) لکھا۔ یہ ناول پہلگام اور امرناتھ یاترا کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اردو میں بھی اُنھوں نے ایک ناول لکھا جس کا عنوان ''شاہد ہے تیری آرزو'' یہ ناول لون نے اُس وقت لکھا جب وہ سرکاری عتاب کا شکار ہوئے اور دہلی چلے گئے۔لون نے بہت کچھ لکھا لیکن زیادہ تر اپنی تحریروں کو چھپوانے میں ناکام رہے۔نور شاہ اپنی کتاب ''جموں وکشمیر کے اردو فسانہ نگار'' میں لون کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لون صاحب کا سبجیکٹ ڈراما تھا اور وہ اپنی زندگی میں کہانیوں کو کتابی صورت
> نہ دے سکے لیکن اُن کی کہانیوں کے معیار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' ۲٦

علی محمد لون نے بہت ساری کہانیاں لکھیں جن میں ''موچھوں والی گڑیا''، ''مہمان''، ''آرزو کا سلسلہ لا انتہا''، ''نالے کا بادشاہ''، ''انسان اور چھینٹے''، ''سکھ کا ساحل''، ''پاپی پجاری کی ستان''، ''دور تنہائی''، ''تم سب میرے ہو'' اور بت شکن اردو ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔لون کے بہت سارے افسانوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیا گیا ہے اور وہ خود بھی ایک اچھے مترجم تھے۔انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ان کے افسانوں میں انفرادی انداز تھا۔ ان کی افسانہ نگاری پر محمد اشرف ٹاک اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ ایک خاص انداز کی کہانی لکھتے تھے۔ اُن کے افسانوں میں نثر نگاری کا ایک الگ انداز اور ایک الگ رنگ نظر آتا ہے''۔ ۲۷

علی محمد لون کی ایک مشہور کہانی ''گھروندے'' ہے۔ یہ کہانی ایک ڈرامائی انداز میں ہے لیکن یہ ڈرامائی انداز کچھ ایسا ہے کی اس میں حقیقت نگاری بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ لون نے کشمیر میں کشتیوں میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی اقتصادی حالت اور ان کے خوشحال مستقبل کی آرزوں کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سندری: میرے اللہ تم نے بے بسوں کی فریاد سُن لی۔ مدت بعد آرزو پوری ہوئی۔ اب تو سارے دُکھ دور ہوں گئے۔

ماں: چھٹی آئی ہے وزٹر آرہے ہیں۔ اب تو سب کچھ پیسوں کے عوض آئے گا کیوں گُلی کے بابا۔'' ۲۸

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں اُس وقت غربت تھی وہاں کے حالات کی خستہ حالی اور سیاحوں کی آمد کے انتظار میں کشتیوں میں رہنے والے لوگ اپنی روزی روٹی کے لئے پریشان رہتے تھے۔ ان غریب کشتی سواروں کی کہانی کو پیش کر کے لون نے اس وقت کے حالات کی سچی وحقیقی عکاسی کی ہے۔

لون کا اس طرح کی کہانی بُننے کا انداز اُن کے ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ علی محمد لون ریاست کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ بھی رہے۔

۶۔ ٹھاکر پونچھی

ریاست جموں وکشمیر کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک اور اہم نام ٹھاکر پونچھی کا آتا ہے۔ اُنہوں

نے ۱۹۳۵ء سے لکھنا شروع کیا۔ ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی کے متعلق کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں کہ ٹھاکر پونچھی کا پہلا افسانہ ''راجہ'' ہے جو رسالہ ''توی'' میں شائع ہوا۔ کشمیر کے مشہور و معروف افسانہ نگار نور شاہ نے ''شیرازہ جموں وکشمیر اردو افسانہ نمبر'' میں لکھا ہے کہ ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی کا عنوان ''کالکی'' تھا جو جموں کے مقامی اخبار ''چاند'' میں شائع ہوا۔ لیکن جان محمد آزاد اپنی تصنیف ''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین'' میں ٹھاکر پونچھی کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خود ٹھاکر پونچھی نے اپنی موت سے دو ہفتے قبل اپنا تعارف کرواتے ہوئے لکھا تھا۔ ریاست جموں وکشمیر کے جاگیردارانہ ماحول میں پیدا ہوا۔ گھناونی اور معصوم زندگی کے قریب نہ کہانی کار کی نگاہ بخشی پہلی کہانی ''خانہ بدوش'' اور اب تک کی آخری کہانی ''بہت دور جانا ہے'' ہے۔'' [۲۹]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی کا پہلا افسانہ ''خانہ بدوش'' ہی ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''زندگی کے دوڑ''، ''چناروں کے چاند'' اور ''زندگی کے موڑ پر'' شائع ہو چکے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی فرائڈ اور مارکس کے نظریے کے حامی تھے۔ وہ پونچھ میں ایک جاگیردارانہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں اُنھوں نے جاگیرداری اور سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے مظالم، بے بسی، تباہ حالی، بیماری اور بے روزگاری کو بڑے قریب سے دیکھا اور اُسے اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر عوام کے خدمت گزار ہوئے اور افسانہ نگار کی حیثیت سے عوامی مسائل پر بھرپور لکھنے لگے۔ افسانے کے فن، ہیت اور تکنیک سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ ان کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے نور شاہ لکھتے ہیں:

> ''ٹھاکر پونچھی انسانی نفسیات اور سیاسی وسماجی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں،

مدھم سروں میں انسانی فطرت کا فنکارانہ چابکدستی سے عکاسی کرتے تھے۔ انداز نگارش کی دلکشی و دل آویزی اور فنی بلندیوں کا امتزاج ٹھاکر پونچھی کے فن کی خوبی ہے۔'' ۳۰

ٹھاکر پونچھی کا عہد سامراجی اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور آزادی کی بشارتوں کا عہد ہے ۔ جہاں نئی اور پرانی تہذیب متصادم ہو رہی تھی نئے مسائل اُبھر رہے تھے۔ جن کو انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اُجاگر کیا ہے۔

ان کا ایک افسانہ ''موت کی موت'' جس میں تہذیبی زندگی کا المیہ پوری طرح سے واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ افسانے کا ایک کردار (رمضانا) اپنے ایک مزدور دوست کی موت کے بعد اُس کے کفن کے لیے پانچ روپے لے کر بازار کی طرف چلتا ہے مگر کہیں بھی اُسے پانچ روپے میں کوئی بھی دوکاندار کفن نہیں دیتا۔ آخر کار نا کام ہو کر پانچ روپے کا نوٹ پھاڑ دیتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کنارے پر کھڑے ہو کر میلے کچلے نوٹ کو پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا اور ندی میں بہا دیا اور اپنی اندھیری گلی سے گھر کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ جہاں بلتی یار اُس کا انتظار کر رہا تھا۔'' ۳۱

افسانے کے آخر میں ٹھاکر پونچھی اس کردار کے ذریعے ترقی پسند نظریے کے تحت پیغام دیتا ہے ۔ اس اقتباس سے ملاحظہ ہو:

''یہ کُھر دے کمبل ایک ریشمی چادر کی بات نہیں ۔ یہ ایک بہت بڑے انسان کی حقیر سی تمنا کی بات ہے ۔ یہ ایک بلتی یار کی زندگی کی موت نہیں، یہ بہت سے بلتی یاروں کی موت ہے۔'' ۳۲

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح اُس دور میں ایک غریب انسان اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیسوں کی کمی کے سبب کفن کے بدلے لاش کو کمبل میں دفن کر دینا اور انسانیت کا مر جانا انسان کی بے بسی کی علامت ہے۔ جسے ٹھاکر پونچھی نے بڑے فنکارانہ انداز میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ٹھاکر پونچھی کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کی اس خصوصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''حقیقت اور رومانیت کا امتزاج ٹھاکر کے افسانوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ برف کے آنسو، خلش کہاں سے ہوتی، بے خواب کواڑ، غرض ہر تحریر کی اپنی ایک خاص مہک ہے۔'' ۳۳

''زندگی کی دوڑ'' ٹھاکر پونچھی کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ جس میں اُنھوں نے ایک بے بس عورت کی کہانی بیان کی ہے۔ جس کے خاوند کی موت کے بعد اس کے ماں باپ دولت کے لالچ میں آکر اُس کی شادی بڑی عمر والے کے ساتھ کروا دیتے ہیں۔ افسانے کا یک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دولت دنیا کا مُنہ بند کر دیتی ہے۔ وہ دولت مند ہے اس لیے کلیان کو چودھری جی اس کے گلے مڑھ رہے ہیں، آگ اور پانی کو ملایا جا رہا ہے۔'' ۳۴

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی نے جاگیردارانہ خاندان کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی اُن کے مسائل اور عیبوں کو اُجاگر کرنے میں کوئی کثر نہ چھوڑی اور ساتھ ہی ساتھ متوسط طبقے کے لوگوں کی مجبوریاں اور غربت کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کرداروں کے ذریعے ٹھاکر پونچھی قاری کو یہ پیغام دیتے ہیں۔ کہ مجبوری ہمیشہ مجبور انسان کی انسانیت کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

ایک اورافسانہ ''موت کے سائے تلے'' ہے،اس افسانے میں ٹھاکر پونچھی نے ایک کردار(میجر ریفرڈ) کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ جو پہلی اور دوسری جنگ میں حصّہ لے کر ترقی حاصل کر کے ایک معمولی سپاہی سے میجر بن جاتا ہے۔افسانے کے کردار کی مفاد پرستی سے متعلق ایک اقتباس دیکھئے:

''اور پھر ایک وقت آیا۔ میں نے انسانوں کو گولی کا نشانی بنایا اور خوش ہوا۔انہیں تڑپتے اور سسکتے دیکھ کر مسرت حاصل کی۔ ترقی ملی ، بہت بڑا رُتبہ حاصل ہوا۔'' ۳۵

افسانے کے آخر میں میجر کا ضمیر اُسے جھُنجھوڑتا ہے اور وہ خود سے مخاطب ہو کر خود کلامی کرتا ہے اور مزدوروں اور کسانوں کے حق کی بات کرنے لگتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ اُجڑے ہوئے کھیت اور ویران کھنڈر یہی کہہ رہے تھے کہ انسانوں کو سپاہیوں کی نہیں کسانوں کی ضرورت ہے ، مزدوروں کی ضرورت ہے۔ پھر اب ایک سپاہی نہیں ہوں ایک کسان ہوں۔'' ۳۶

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی نے اپنے افسانوں میں فن کے ساتھ ایسے کردار تخلیق کیے ہیں۔ جو متحرک ہیں اور واقعات اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ بُرائی کو ترک کر کے بُروں کا دل بدلنا ٹھاکر پونچھی کا مقصد ہے جو ترقی پسند تحریک کا بھی منشور ہے۔افسانہ ''موت کے سائے تلے'' کے علاوہ ''مرد عورت''، ''حکومت''، ''پگڑی پگڑی''، ''کتنا سفر''، ''موت سے پہلے''، ''چناروں کے چاند'' اور ''چکنا'' ان کے مشہور افسانے ہیں جو ترقی پسند تحریک کی ترجمانی کرتے ہیں۔

۷۔موہن یاور

ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں میں موہن یاور ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔موہن یاور نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تقسیم ملک سے پہلے کیا اور آزادی کے بعد بھی ان کے افسانے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد تین ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''وِسکی کی بوتل'' جو ۱۹۵۷ء میں دوسرا فسانوی مجموعہ ''سیاح تاج محل'' جو ۱۹۶۱ء میں اور تیسرا ''تیسری آنکھ'' شائع ہو چکے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''وِسکی کی بوتل'' کا پیش لفظ ٹھاکر پونچھی نے لکھا ہے۔اس میں ٹھاکر پونچھی موہن یاور کو ایک عظیم سرکش اور باغی افسانہ نگار کے القاب سے یاد کیا ہے۔جموں کی سرزمین سے دلکش افسانے تخلیق کرنے والے موہن یاور کی زبانت پر زور دیتے ہوئے ٹھاکر پونچھی رمزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''سعادت حسن منٹو کے علاوہ اگر کسی افسانہ نگار نے افسانہ نگاری کی بنجر پتھریلی
> دھرتی میں بیج بوئے کھیتی کاٹی اور اس فصل کے بوئے پر اپنی پیاس سانسوں سے
> آبیاری کی ہے تو وہ موہن یاور ہے۔'' ۳۷

دوسرا افسانوی مجموعہ ''سیاح تاج محل'' افسانہ نگاری کے فن پر ایک مضبوط گرفت کا ثبوت ہے ۔جس پر ریاستی کلچرل اکاڈمی نے انہیں انعام سے نوازا۔موہن یاور کے افسانے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں ریاست جموں کشمیر کی جنگ آزادی اور حالات کو موضوع بنا کر بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کا ایک مشہور افسانہ '' پتھر کا بُت'' ہے ۔جس میں انہوں نے ترقی پسند نظریے کے تحت کرداروں کے ذریعے زندگی کا اصل مقصد سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔کہانی میں ایک آدمی کے

دو بیٹے ہوتے ہیں اور وہ دونوں کو اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلنے کی نصیحت کرتا ہے۔ دونوں بیٹوں کا نظریہ الگ الگ ہوتا ہے ایک باپ کی نصیحت پر عمل کر کے فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا قلم سے پیار کر کے ادب کی خدمت کرنا چاہتا ہے ایک بیٹا اپنے باپ سے کہتا ہے:

''اندھیرے میں بھٹکنے والے مسافرو! اندھیرے کا راج ختم ہو رہا ہے۔ میں روشنی کا سرچشمہ ہوں اور میں جیون داتا ہوں۔ دھیرے دھیرے چل پڑو۔۔۔منزل اپنے آپ تمارے قدم چوم لے گی۔'' ۳۸

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں موہن یاور اُن پنڈتوں اور جاگیرداروں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو قدامت پرست ہیں، جو ڈاکٹر کے بجائے جڑی بوٹیوں سے علاج کرانے پر یقین کرتے ہیں۔ اس افسانے کے ذریعے موہن یاور اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب حقیقت کو سمجھنے اور زندگی گزارنے کا نیا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ افسانے کا آخری جملہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً:

''بابا تمارے ہاتھ میں دونالی ہے اور میرے ہاتھ میں قلم۔'' ۳۹

اس طرح سے موہن یاور نے اور کئی افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً ''بستی بستی''، ''سیاح تاج محل'' اور ''وِسکی کی بوتل'' وغیرہ ان کے قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں ،محرومیوں اور تمناؤں کو سامنے لانے کی بھر کوشش کی گئی ہے۔ ان کی افسانوں پر دیوندر ستارتھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موہن یاور کے افسانوں میں ہمارے گرد و پیش کی زندگی سانس لیتی ہے۔''

۴۰

دیوندر ستارتھی کی رائے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موہن یاور نے اپنے اطراف و کناف کے مسائل کو پیش کر کے حقیقی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے مختصر افسانوں کے ذریعے تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

۸۔ رامانند ساگر

رامانند ساگر بھی اُس عہد کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی شہرت خاص کر اُن کے ناول ''اور انسان مر گیا'' کی وجہ سے زیادہ ہے۔ لیکن بہت سارے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جوار بھاٹا'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ جو سترہ منتخب افسانوں پر مشتمل ہے اور دوسرا '' آئینے'' میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔

رامانند ساگر کا انداز و بیان طنزیہ ہے۔ جس میں ظرافت کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اُنہوں نے جو افسانے لکھے وہ اُن کے افسانوی مجموعے '' آئینے'' میں شامل ہیں۔ جن میں افسانہ ''ٹنگمرگ کے اڈے پر'' ان کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ '' بخشش'' بھی کشمیری عوام کی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

افسانہ ''ٹنگمرگ کے اڈے پر'' ان کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ ٹنگ مرگ کشمیر میں ایک جگہ ہے جہاں تک پہلے سیاح لوگ گاڑیوں میں جاتے تھے اور اس کے بعد وہاں سے سیاحوں کو سونہ مرگ کی سیر کے لیے گھوڑوں پر لے جایا جاتا تھا۔ اُن غریب گھوڑے والے مزدوروں کی زندگی کو رامانند ساگر نے اپنے اس افسانے کا موضوع بنا کر اُن کی معاشی حالت، اُن پر سپاہیوں کا ظلم اور اُن کی بے بسی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دور سے یوں دکھائی دیتا۔ گویا مفلس ہندوستان کی رُوح چند ٹکوں کے لیے

چیختی اور چلاتی اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے ۔ تار تار ہو گئے ۔۔۔فرنوں میں میل بھرے بالوں، کچیلے جسموں اور بوائی سے زخمی ہاتھوں اور پیروں والی آتما۔۔۔'' ۴۱؎

رامانند ساگر نے یہ سب کچھ قریب سے دیکھا کہ کس طرح کشمیر میں ایک طرف سانس لیتے ہوئے غریب مزدور اپنی روزی روٹی کے لیے غربت میں اپنی جان سے کھیل رہے ہیں اور دوسری طرف وہاں کے ریاستی سپاہی رشوت نہ دینے پر ان پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔اس افسانے سے ایک اقتباس سے دیکھئے:

''میرے پاس ایک پیسا بھی نہیں ہے۔اگر آپ مہربانی کریں گے تو صاحب سے ملتے ہی واپس آ کر دے جاؤں گا۔

ریاستی سپائی نے دانت نکال دیئے۔گویا ایک طنزیہ ہنسی ہنستا رہا اور آگے بڑھتا ہوا کہتا گیا۔''یہ کشمیری کتنے مکار ہوتے ہیں۔ابھی کل اُس شام اس کے پاس چار آنے تھے۔'' ۴۲؎

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رامانند ساگر نے مظلوم کشمیریوں کی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ اُن پر ظلم وستم ڈھانے والے بے درد رشوت خوروں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔عبدالقادری سروری رامانند ساگر کا تعارف کرواتے ہوئے اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اپنے قیام ٹنگمرگ کے بارے میں ایک افسانہ ''ٹنگمرگ کے اڈے پر'' کے عنوان سے لکھا تھا جو کشمیر کی فضائی پس منظر اور زندگی کو بھی خوبی سے پیش کرتا ہے۔'' ۴۳؎

اس رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ رامانند ساگر نے کشمیر کے ٹنگمرگ علاقے میں کافی وقت گزارا اور یہاں کے عوام کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر ایسا شاہکار افسانہ لکھنے میں کامیابی حاصل کی۔اس کے علاوہ ساگر نے اپنے افسانوں میں کرداروں کی نفسیات اور اندرونی کیفیات کی عکاسی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔وہ خارجی اور ظاہری واقعات سے زیادہ انسان کے باطنی اور اندرونی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس امتیاز کو اُن کا منفرد آرٹ بھی کہا جاتا ہے۔

ملک تقسیم ہونے کے بعد اُنھوں نے اپنے ناول ''اور انسان مرگیا'' میں یہی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے نام سے برصغیر کے عوام کو آزادی تو مل گئی لیکن انسان مرگیا۔یعنی ہندو مسلم کے فسادات نے انسانیت کو ماردیا۔اس کے علاوہ بعض افسانوں جیسے'' آب وحیات'' اور'' آب وآتش'' میں بھی انسانی نفسیات کی گرد میں کھول کر انسان کو ایک آزاد وجود کے طور پر دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔رامانند ساگر نے افسانہ نگار سے زیادہ ہندوستانی فلموں کے فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے شہرت پائی اور آخر کار فلمی دنیا کو خیر باد کر کے ممبئی میں انتقال کر گئے۔

۹۔حامدؔی کشمیری

پروفیسر حامدؔی کی کشمیری علمی اور ادبی زندگی کے کئی روپ ہیں۔وہ افسانہ نگار بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، ناقد بھی ہیں اور معتبر استاد بھی ہیں۔حامدؔی کو ہم ترقی پسند افسانہ نگار تو نہیں کہہ سکتے لیکن اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ'' وادی کے پھول'' پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ حامدؔی ترقی پسند نظریہ بھی رکھتے تھے۔اپنی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فکشن کے روایتی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے میں دراصل دو باتوں کو زیادہ اہمیت دیتا رہا۔اوّل، حقیقی زندگی کی تخیلی تشکیل۔یہ گویا خارجیت اور

مقصدیت کا رجحان تھا جسے میں اپنے ذہن وفکر پر حاوی محسوس کرتا رہا اور

افسانے لکھتا رہا۔'' ۴۴؎

حامدیؔ کے کل چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا ''وادی کے پھول'' جو ۱۹۵۷ء میں شاہین بک اسٹال سرینگر سے شائع ہوا۔ اس میں کل سولہ (۱۶) افسانے شامل ہیں۔ دوسرا ''سراب'' (۱۹۵۹ء)، تیسرا ''برف میں آگ'' (۱۹۶۱ء) اور چوتھا ''شہرِ افسوں'' (۲۰۰۹ء) میں راج باغ سرینگر سے شائع ہوا۔

حامدیؔ نے اپنے ابتدائی افسانوں میں کشمیر کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نور شاہ لکھتے ہیں:

''ان کی اکثر کہانیوں میں کشمیر کا ماحول، سماجی اور سیاسی حالت اور یہاں کے

لوگوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔'' ۴۵؎

جہاں تک حامدیؔ کی کردار نگاری کی بات کی جائے تو ان کے افسانوں کے کردار کشمیری عوام کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ جو حقیقی طور پر کشمیر کا آئینہ بن کر قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری پر پروفیسر شکیل الرحمٰن اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے کردار جیتے جاگتے اور یہاں کی فضا میں سانس لیتے ہوئے کردار ہیں۔

حامدیؔ ان کرداروں کی مدد سے کشمیر کی زندگی پیش کرتے ہیں۔'' ۴۶؎

حامدیؔ نے اپنے اکثر ابتدائی افسانوں میں کشمیر کی حقیقی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''ٹھوکر'' ہے۔ جو ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ ''شاہین'' میں شائع ہوا۔ جس میں اُنہوں نے کشمیر کے سرمایہ داروں کو بے نقاب کیا ہے۔ افسانے کا کردار (شمبو) ہے جس کے ذریعے سرمایہ داروں کا ظلم اور بے روزگاری کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک انسان سرمایہ داروں

کا غلام بن کر نوکری کرتا ہوا بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اور راحت آنے تک اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔نوکری سے خارج ہونے کے بعد سرمایہ داروں کے قرضے میں ڈوب کر ساری عمر ٹھوکریں کھاتا ہوا یہ انسان آخر کار اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جس کو حامدؔی نے بڑے فنکارانہ انداز میں کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج بھی ایک غریب کی زندگی کتنی تلخ ہے۔۔۔کتنی تلخ۔۔۔زہر کا ایک پیالہ ہے۔جس کو پینے کے لیے وہ مجبور ہے۔اور سرمایہ دار اب بھی دولت میں کھیلتے ہیں۔مفلسوں کی آشناؤں سے کھیلتے ہیں۔ان کے لہو سے کھیلتے ہیں۔کتنا فرق ہے انسان اور انسان میں لیکن یہ فرق کیوں؟۔۔۔سب بھگوان کے بندے ہیں اور اب آزادی بھی تو آئی ہے! اُف ۔۔'' ۴۷؎

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حامدی نے یہ افسانہ جنگ آزادی کے بعد یعنی ۱۹۵۱ء میں لکھا ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ اُس وقت اُنہوں نے اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر ہو کر یہ کہانی قلم بند کی ہے۔اسی لیے وہ آخر میں یہ کہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ملک آزاد ہونے سے پہلے کتنی اُمید تھی کہ ملک میں امن آئے گا بے روزگاری دُور ہوگی لیکن آج بھی ویسی ہی صورتحال ہے۔جو آزادی سے پہلے تھی۔

اس افسانے کے علاوہ حامدؔی نے بہت سے افسانے لکھے جو کشمیر کی حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان میں ''دیکھتا ہی رہ گیا''،''اگلے اتوار کو''،اور''کرم دین''وغیرہ جوان کے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل ہیں۔حامدؔی مکمل طور پر ترقی پسند افسانہ نگار نہیں ہیں۔لیکن ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

۱۰۔ تیج بہادر بھانؔ

تیج بہادر بھانؔ ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک اہم افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۱ء میں کہانی ''لاچیزی'' لکھ کر کیا۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے ''جہلم کے سینے پر'' (۱۹۶۰ء) اور ''عورت'' (۱۹۶۲ء) شائع ہو چکے ہیں۔ بھانؔ نے اپنے ابتدائی افسانوں میں معاشرتی اور سیاسی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ عام لوگوں کے مسائل، متوسط طبقے کی پریشانیاں، دُکھ سکھ، ناکامیاں اور محرومیاں بھی ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔

''جہلم کے سینے پر'' کے عنوان سے تیج بہادر بھانؔ نے جو کہانی لکھی۔ وہ بے حد مقبول ہوئی۔ اس افسانے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ بھانؔ نے زندگی کا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور کیشتی میں رہنے والے ہانجیوں کے دُکھ درد سمجھنے اور سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر افسانے سے ایک اقتباس:

> ''اور زونی کا پیٹ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے پھرن کے باوجود اُبھار صاف نمایاں تھا۔ لیکن زونی اس فکر سے بے نیاز چپو تھامے خاموش کھیتوں کو تک رہی تھی۔ کھیتوں سے پرے دور نیلے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رزاقؔ کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ پہاڑ اس کے ارد گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ مہیب دیوزادوں کی طرح خاموشی سے اس کی بربادی کے منتظر ہیں۔ خاموشی اس کے کانوں پر بوجھ بن کر چھانے لگی اور اس کے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ شہر جلدی پہنچ جائے۔''[۴۸]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کردار زونی کی کہانی ایک عورت کی کہانی ہے جو درد سے

تڑپ کر بھی اپنے شوہر کو اپنا درد محسوس نہیں ہونے دیتی ہے۔ ہر حال میں چپو چلانے میں اپنے شوہر کی مدد کرتی ہے اور کشتی میں ہی بچے کو جنم دیتی ہے۔اس کی زندگی کے مسائل بھانؔ نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کئے ہیں۔

بھانؔ نے کئی افسانے لکھے جن میں حقیقی زندگی کے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ مثلاً ''وانکہ پن'' اُن کا پہلا شاہکار افسانہ ہے جو خواجہ احمد عباس کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''سرگرم'' میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ افسانہ تلاش، جوتے، سہارا، عورت، میری اپنی بچی، اندازہ اور سنتوش وغیرہ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔جن میں عام لوگوں کے مسائل، دُکھ درد اور پریشانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

تیج بہادر بھانؔ کے افسانوں میں بعض جگہ املا کی غلطیاں ملتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی تخلیقات ادبی معیارات پر پورے طور کامیاب نہیں مانی جاتی ہیں۔اُن کی خامیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں:

> ''ان کی تمام خامیوں کے باوجود تیج بہادر بھانؔ ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو آج نہیں تو کل اوروں سے اپنا لوہا منوا کر رہے گا۔'' ۴۹

تیج بہادر بھانؔ ایک ایسے افسانہ نگار تھے جو ترقی پسند نظریہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ آج بھی ریاست کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

۱۱۔قدرت اللہ شہاب

ریاست جموں کشمیر کے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی صف میں قدرت اللہ شہاب کی شہرت ایک عظیم ادیب، سیاست دان اور دانشور کی حیثیت سے ہے۔قدرت اللہ شہاب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا لیکن اُن کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ اُن کی خودنوشت ''شہاب نامہ'' ہے۔ یہ ایک

تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک اور تحریک آزادی کے حوالے سے بعض سرگرمیوں کا ذکر ملتا ہے اس میں وہ خود بھی اعلیٰ آفیسر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات ''آتش چنار'' کے بعد ''شہاب نامہ'' ہی دوسری کتاب ہے جس میں ریاست کی تحریک آزادی کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ جس سے ریاست کے عام لوگ ناواقف تھے۔ آج بھی ''شہاب نامہ'' ایک مقبول عام تخلیق مانی جاتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب کا پہلا افسانہ ''چندراوتی'' ہے۔ جوان کا حقیقت پر مبنی افسانہ ہے۔ جو انہوں نے اپنی پہلی محبت کے پس منظر میں لکھا ہے۔ جسے اختر شیرانی نے اپنے میگزین ''رومان'' میں ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ ''پہلی تنخواہ''، ''جسونت سنگھ''، ''شلوار''، ''دورنگا''، پشاور ایکسپرس''، کھول دو'' اور لاجونتی وغیرہ تقسیم ملک پر لکھے گئے اہم افسانے ہیں۔

''یاخُدا''، تقسیم ملک سے برپا ہونے والے فسادات پر لکھا گیا ان کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار (دلشاد) ہے جو ایک جوان عورت ہے۔ جو ملک کے مختلف علاقوں میں ہجرت کر کے ہر جگہ طرح طرح کی مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی اُجڑ کے رہ جاتی ہے۔ اس افسانے میں ملک کے بگڑے حالات کے ساتھ ساتھ کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و بربریت کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔ اس زمانے میں ڈوگروں نے کشمیری مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ لوگ دور دراز کے علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور اپنے وطن کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ جس کی مثال افسانے کی کردار (دلشاد) پیش کرتی ہے جس کی آنکھیں ڈوگروں کے ظلم وستم سے اندھیرے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب لہروں کے تلاطم پر کشش کا سینہ ڈگمگاتا تو اسے اپنا ہلکا شکارا یاد آتا، جو اسی

طرح ڈل اور ولر کی نازک لہروں پر تھرتھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اُس نے
سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اُسے قے آ گئی۔۔۔اُف! کتنا کڑوا پانی تھا۔ڈل کا
پانی تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا ارور چشمہ شاہی کا پانی ہائے جیسے دودھ اور مکھن
اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی
دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سرخ؟ نیلا ہے یا سبز۔'' ۵۰؎

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملک تقسیم ہونے سے پہلے کشمیر میں ڈوگروں کا راج تھا اور وہ کس طرح مسلمانوں پر ظلم وستم کرتے تھے۔عورتوں کی عزت لوٹ کر اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے۔شہاب صاحب نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس افسانے کے ذریعے ڈوگرہ تانا شاہی کو بے نقاب کر کے حقیقت کو سامنے لانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

تقسیم ملک کے بعد قدرت اللہ شہاب پاکستان چلے گئے اور وہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ملک تقسیم ہونے سے قبل بھی اُنہوں نے ریاست میں رہتے ہوئے بہت سے ایسے افسانے لکھے جن میں آزادی کا خواب اور غلامی کا کرب صاف طور پر نظر آتا ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانے'' درد کا درماں'' اور'' جسونت سنگھ'' بے حد اہم ہیں۔قدرت اللہ شہاب کے زیادہ تر افسانوں میں کشمیری زندگی کی سچائی نظر آتی ہے۔جس کا اندازہ اُن کی خودنوشت'' شہاب نامہ'' سے بھی لگایا جاتا ہے۔خودنوشت ''شہاب نامہ'' کی تعریف کرتے ہوئے نور شاہ لکھتے ہیں:

''جنہوں نے'' شہاب نامہ'' نہیں پڑھا ہے۔پڑھنے کی درخوست کرتا ہوں۔یہ
کتاب پڑھ کر زندگی کی بہت ساری سچائیاں سامنے آتی ہیں۔اُنہوں نے اپنی
تحریروں میں سچائی کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔سچائی اُن کی

زندگی تھی اور زندگی ان کی سچائی۔۔۔۔!''۔ ۵۱

۱۲۔ برج پریمی

ریاست جموں وکشمیر کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک اور اہم نام برج بریمی کا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز آزادی کے بعد کیا۔ اُن کا پہلا افسانہ'' آقا'' ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور مختلف اخباروں اور جرائد سے اپنے افسانے شائع بھی کرواتے رہے۔ پریمی کی حیات میں اُن کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوسکا۔ بعد میں اُن کے فرزند جن کا نام'' پریمی رومانی'' تھا، اُنھوں نے ان کے افسانوں کو اکٹھا کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کیا۔ جو ۱۹۹۵ء میں'' سپنوں کی شام'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔

برج پریمی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ اس لیے اُنھوں نے رومانیت سے ہٹ کر حقیقت پسندی پر اپنا قلم اُٹھایا جس کا ثبوت ان کا افسانوی مجموعہ'' سپنوں کی شام'' ہے۔ اس کے پیش لفظ میں کشمیری لال ذاکر ان کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے اور انھیں ترقی پسند ادیب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''برج پریمی بنیادی طور پر ترقی پسند ادیب تھا اور افسانوی ادب کو اس کی بہت بڑی دین یہی ہے کہ اس نے کشمیر کی وادی کو ایک زہین، دردمند اور انسان دوست ادیب کی نظر سے دیکھا اور اس کی نگاہیں ان مسائل پر جمی رہیں جو ایک عام آدمی کے مسائل تھے وہ آج بھی اُسی طرح سے اپنا حل تلاش کرانے کے لیے ترس رہے ہیں۔ شاہد اُن کا حل موجودہ نسل پیش نہیں کرسکے گی۔'' ۵۲

برج پریمی نے اپنے افسانوں میں جموں کشمیر کے ملازمت پیشہ اور اُن کی مشکلات، گاؤں کی

سڑکوں کے حالات کے ساتھ ساتھ گاؤں میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے احساسات، جذبات، ایثار، قربانی اور شرم وحیا کو موضوع بنا کر افسانے پیش کئے ہیں۔ جس کی ترجمانی اُن کے افسانوی مجموعہ ''سپنوں کی شام'' سے ہوتی ہے۔

افسانوی مجموعہ ''سپنوں کی شام'' میں شامل اُن کا ایک شاہکار افسانہ ''شرناتھی'' ہے جو حقیقت پر مبنی افسانہ ہے جس کا موضوع فسادات ہے۔ اس افسانے میں بٹوارے کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں پیدا شدہ حالات اور قبائلیوں کے ظلم وستم کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ جسے پریمی نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے، افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ایک منحوس صبح پھوٹنے سے پہلے ہی فضا پر ماتم چھا چکا تھا، زمین اور پہاڑوں پر ایک کپکپاہٹ سے پھیلی ہوئی تھی۔ دور پہاڑی کی معصوم پگڈنڈی پر ایک کارواں جا رہا تھا۔ دھماکے ہونے لگے، دھرتی کانپ سی اُٹھی،، ڈر،، ڈر،، خوفناک آوازیں ڈولنے لگیں۔ لوگ حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات میں کھو گئے۔ کارواں گاؤں کے نزدیک پہنچ چکا تھا عجیب لباس اور عجیب شخصیت کے یہ انسان وحشیانہ ہنسی ہنس رہے تھے۔ کندھوں پر بندوقیں تھیں۔ آتے ہی اُنھوں نے بیٹوں اور بہنوں کے ساتھ چھیڑ کی۔'' ۵۳

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بٹوارے کے بعد کس طرح کشمیر کے اندر حالات خراب تھے۔ قبائلی کشمیریوں اور اُن کی ماں، بہن اور بیٹیوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ اس ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے کشمیریوں کی مدد ہندوستانی فوج نے کی۔ لیکن اس کے بعد ہندوستانی فوج نے بھی کشمیریوں کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم کرنے میں کوئی کثر باقی نہ چھوڑی۔ جس کا اندازہ افسانے کے اس اقتباس سے لگایا

جا سکتا ہے:

''دوسرے دن ٹرک میں لاکران کو سرینگر ملٹری کواٹر میں بھیج دیا گیا جہاں ہفتہ بعد ان کے بیانات اور رپورٹیں لی گئیں اور شام نے روتے روتے اپنی بپتی کہانی سنائی۔ایک دن بعد اُن کی جان چھوٹی اور اُنھیں ایک ریفوجی کیمپ میں جگہ مل گئی۔ پناہ گزیوں کے کیمپ میں وہ تین ماہ رہا اور جو کچھ اُس نے وہاں دیکھا ،اُس سے اس کا ضمیر کانپ اُٹھا۔اس نے اپنی ماوں اور بہنوں کو دیکھا،اس نے معصوم بچوں کو بلکتے دیکھا، اس نے عصمتوں کو لوٹتے دیکھا،اس نے ضمیر کی موت دیکھی،اس نے ہمالیہ کی سخت چٹانوں سے زیادہ سخت دل دیکھے''۔ ۵۴

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف قبائلیوں کا حملہ اور دوسری طرف ہندوستانی فوج کی بدسلوکی نے کشمیریوں کی زندگی میں غم اور رسوائی پیدا کی ۔جس کی جیتی جاگتی تصویریں ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔آج بھی یہی صورتحال کشمیر میں نظر آتی ہے۔جس سے کشمیری تنگ آکر آزادی کی مانگ کرر ہے ہیں۔ برج پریمی نے اس افسانے کے ذریعے اس حقیقت کو سامنے لانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

برج پریمی نے کئی افسانے لکھے ہیں۔جن میں انہوں نے غریبوں، لاچاروں،مزدوروں اور سماج میں رہنے والے نچلے طبقے کے لوگوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام کو بھی موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔آخر کار ۱۹۹۰ء میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔

۱۳۔اختر محی الدین

اختر محی الدین ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کی صف اول میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

اختؔر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا۔ اس کے علاوہ بہت سارے افسانے کشمیری زبان میں بھی لکھے جن میں بیشتر افسانوں کا ترجمہ اردو میں بھی کیا گیا۔لیکن ان کی پہچان افسانہ ''پونڈر چ'' سے ہی ہوتی ہے جس کو بین الاقوامی مقابلے میں دوسرے انعام سے نوازا گیا۔ اس کے بعد یہ افسانہ رسالہ '' افکار'' کراچی سے شائع ہوا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ ''ہندوستان ٹائمز'' میں شائع ہوا ہے۔

اختؔر محی الدین نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان ایسے کئی افسانے لکھے جو حقیقت پر مبنی ہیں۔مثلاً پونڈر چ، بھاو گر رہے ہیں، اور رات مرگئی، پیوند اور گدھ قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ان افسانوں میں اختؔر نے کشمیر کے سیاسی ، سماجی ، مذہبی ،غریبی اور لاچاری وغیرہ کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ان کا مشہور افسانہ ''پونڈر چ'' ہے۔جس کا مرکزی کردار ایک بھکاری ہے جس کو (پونڈر چ) کا نام دے کر بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔کہ کس طرح ایک بھکاری کو لوگ اپنی ہم پرستی کے سبب درویش کا درجہ دیتے ہیں اور خدمت گزاری میں بھی کوئی کثر باقی نہیں چھوڑتے ہیں۔لیکن پھر بھی ایک دن اچانک ۔۔عقیدت مندی کا جب مطلب پورا نہیں ہوجاتا تو وہ پونڈر چ کے ساتھ نہایت بدسلوکی پر اُتر آتے ہیں۔مثلاً اقتباس دیکھئے:

> ''آواز سنتے ہی اس آدمی میں پھر سے جان آئی۔اس نے پونڈر چ کو پکڑ کر بہت
> پیٹا اور ساتھ ہی ساتھ چور چور بھی چلاتا رہا۔ پولیس موقع واردات پر پہنچی اور
> پونڈر چ کو گرفتار کرلیا گیا۔'' ۵۵؎

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زیادہ تر لوگ پنڈتوں، پیروں اور درویشوں کی باتوں پر یقین رکھتے تھے۔اُن کی بات اگر سچ نکل جاتی تھی تو لوگ اُن کو آقا مانتے تھے مگر جب کوئی بات غلط ثابت ہوتی تھی تو اُس کو مار پیٹ کر پولیس کے حوالے کردیتے تھے۔اختؔر محی الدین نے اپنے

افسانوں میں ایک فقیر سے متاثر ہو کر یہ کہانی لکھی۔ کہ آج بھی ہمارے ملک میں چوروں اور ٹھگوں کی جماعتیں موجود ہیں جو لوگوں کو لوٹ رہی ہیں۔لیکن افسانہ نگار نے ایک فقیر کی بے بسی کو افسانے کردار (پونڈر چ) کی اندرونی کشمکش کا جائزہ لیتے ہوئے بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔''ہندوستان ٹائمز'' نے اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ایک نئے افسانہ نگار کی دریافت ہے۔جس نے افسانے کے فن کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔'' ۵۶

اختر محی الدین نے اردو میں بہت کم افسانے لکھے لیکن جو بھی لکھا وہ قابلِ تعریف ہے۔ان کے افسانے پڑنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کشمیریوں کی بے بسی اور مجبوریوں کو نزدیک سے دیکھ کر اس کو کہانیوں کا جامع پہنا کر پیش کیا ہے۔اختر محی الدین ایک ترقی پسند نظریے کے حامی افسانہ نگار تھے جنہوں نے ''پونڈر چ''، ''پیوندہ''، ''اور رات مرگئی'' اور'' گدھ'' جیسے افسانے لکھ کر حقیقت کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔

۱۴۔نرسنگھ داس نرگس

ملک تقسیم ہونے سے قبل کے افسانہ نگاروں کی صف میں نرسنگھ داس نرگس ایک اہم مقام کے حامی تھے۔ جو اپنی تصنیف ''ڈوگرہ دیس'' سے پہچانے جاتے تھے۔لیکن اتنا ہی نہیں اُنھوں نے ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔افسانے کے علاوہ وہ اخبارات اور رسائل سے بھی جڑے رہے۔شروع شروع میں (ممولا رام کوٹی) اور (پریم موہن) کے فرضی نام سے افسانے تحریر کرتے رہے۔ پریم چند سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے افسانوں میں گاؤں اور قصبوں کے معصوم، مفلس اور محنت کش عوام اور زمینداروں کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں اُس وقت ڈوگرہ راج غریبوں اور کسانوں پر ظلم وستم

ڈھا رہا تھا۔ اُن غریبوں، بے بسوں اور مزدوروں کو داسؔ نے موضوع بنا کر حقیقت کو سامنے لانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں پر جان محمد آزادؔ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے وہ ہیں:

''ان کی بیشتر کہانیوں کا موضوع گم گشتہ خوابیدہ دیہات میں بے بس اور مظلوم لوگوں کا افلاس اور اُن کی جہالت ہے۔ ان کہانیوں میں جگہ جگہ ڈوگرہ ثقافت کے نقش اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔'' ۵۷

نرسنگھ داسؔ نرگس نے ایسے بہت سے افسانے لکھے جن میں ڈوگرہ راج پوری طرح بے نقاب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا ایک مشہور افسانہ ''اچھی عید آئی'' کے عنوان سے ہے سیدھے سادے انداز میں لکھا ہوا یہ افسانہ آزادی سے قبل شخصی راج کے سماجی نظام پر ایک زبردست طنز ہے۔ جس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''قبرستان میں ایک قبر کھودی جا رہی تھی سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ تحصیل دار نے غلاموں کے پیٹ میں ایسی لات جمائی کہ غریب کا بیٹا موت کے گھاٹ اُتر گیا اور یہ راز پوشیدہ نہ رہا کہ کس طرح تحصیل دار کو پتہ چل گیا تھا کہ اس گاؤں میں غلاماں کی بہن سب سے خوبصورت لڑکی ہے اور جب بھائی سے بہن کی پیش کش کے لیے کہا گیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور اس کی پاداش میں اُسے موت کے مُنہ میں جانا پڑا۔'' ۵۸

یہاں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈوگرہ حکومت کے دوران ریاست جموں وکشمیر میں کس طرح شخصی راج غریب طبقے کے لوگوں کو مجبور کر کے اُن پر ظلم وستم ڈھا رہا تھا جس کو داسؔ نے قریب سے دیکھا اور اپنے افسانوں کی صورت میں ڈوگرہ حکومت کی زیادتیوں کو بے نقاب کیا ہے۔

نرسنگھ داس نرگس کا نام اُس زمانے کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جنہوں نے ادب کے فروغ میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔

راقم الحروف نے ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کے عہد کے اُنیس (۱۹) افسانہ نگاروں کے یہاں اس تحریک کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء تک ہی متعین کیا جاتا ہے لیکن اس دوران ملک تقسیم ہوجاتا ہے اور ہماری ریاست کے بہت سے افسانہ نگار پاکستان منتقل ہوگئے۔ جن میں قدرت اللہ شہاب، کوثر سیمابی، محبوبہ یاسمین، محمد عمر نورالہٰی، طالب گورگانوی، شیخ منظور اور گلزار احمد فدا وغیرہ پاکستان چلے گئے، اور رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر ،جگدیش کنول، کندل لال، ٹھاکر پونچھی اور پریم ناتھ در وغیرہ ملک کے دیگر حصوں میں جا کر رہائش پذیر ہوگئے۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ادیب تھے جنہوں نے ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا اور ان کی فنی قدریں ابھی متعین نہیں ہوئی تھیں۔ بعض کی تخلیقات اب نایاب ہیں جس کی وجہ سے ان کے بارے میں اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ زندگی کے تقاضے بدل گئے اور حالات کو معمول پر آنے میں وقت لگ گیا۔ ترقی پسند تحریک جو بڑے پیمانے پر عوام کی کفالت کر رہی تھی زوال پذیر ہوگئی، ادیب وشاعر بھی اس سے بیزار ہوگئے۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی تحریک و رجحان ایک ساتھ پنپ کر سامنے نہیں آتا ہے اور نہ اس کے اثرات ختم ہوتے ہیں۔ البتہ وقت اور زمانے کے تقاضے نئے نظریے وجود میں لائے اور پُرانے نظریے کے مقرر شدہ زاویوں سے خلط ملط ہوکر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کے اثرات سرے سے ختم نہیں ہوئے بلکہ عصرِ حاضر میں بھی اس تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔ عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں نورشاہ، ترنم ریاض، شبنم قیوم، زنفر کھوکھر، مشتاق احمد وانی، طالب کاشمیری، سیدہ نگہت فاروق، میر ایوب

میر، ناصر ضمیر اور ریاض توحیدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

۱۵۔ترنم ریاض

اردو افسانے کو نئی جہتوں اور نئے تجربوں سے آشنا کرنے والے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ترنم ریاض کا ہے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۳ء سے کیا۔ان کی پہلی کہانی ۱۹۷۵ء میں رونامہ'' آفتاب'' میں شائع ہوئی،اس کے بعد ان کی کہانیوں کا سلسلہ آج بھی رواں دواں ہے۔ترنم ریاض کے چار افسانوی مجموعے'' یہ تنگ زمین''،'' ابابلیں لوٹ آئیں گی''،'' میرا رختِ سفر''، اور'' یمبر زل''منظرعام پر آ چکے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری پر اظہار و خیال کرتے ہوئے نور شاہ لکھتے ہیں:

''ان کی تحریروں سے سنگیت اُبھرتا ہے،ان کے اسلوب میں جو نیا پن ملتا ہے،
ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کنول کے پھولوں پر بکھرتے سفید موتیوں کی
جو برسات نظر آتی ہے وہ ان کی افسانوی انفرادیت کی دلیل ہیں۔'' ۵۹

ترنم ریاض کا تعلق کشمیر سے ہے لیکن اب مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی ہے۔کشمیر سے دور رہ کر بھی ان کے دل میں کشمیر کے لیے محبت اور ہمدردی کا جذبہ جھلک رہا ہے۔ان کے بیشتر افسانے کشمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔''یمبر زل''عصرِ حاضر میں لکھا ہوا ان کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔جس میں انہوں نے کشمیر کے بادشاہ یوسف شاہ چک کی داستان کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔یوسف شاہ چک کو مغل بادشاہ اکبر نے دھوکے سے قید کیا تھا اور ان کی یاد میں، ان کی اہلیہ حبہ خاتون نے دم توڑ دیا تھا۔اس داستان کو ترنم ریاض نے بڑے فنکارانہ انداز میں سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کر گیا۔وطن کی مٹی بھی اُسے

نصیب نہ ہوئی ۔۔۔اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہوگئی ۔ہجر کے نغموں سے
بیاضیں سیاہ کر دیں۔آخر کار اپنے یوسف کو پکارتے پکارتے حبہ خاتون نے بھی
اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔'' ۶۰؎

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترنم ریاض اس افسانے کے ذریعے ایک طرف کشمیر کی تاریخ کو سامنے لاتی ہے اور دوسری طرف ہمیں کشمیریوں پر ظلم وستم کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ یہاں کشمیر کے لوگوں کی غربت میں ڈوبی زندگی کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ان مسائل کو ترنم ریاض نے بادشاہ یوسف شاہ چک اور ان کی اہلیہ (حبہ خاتون) کے کردار کا نام دے کر بڑے علامتی اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ ڈوگرہ راج کے ظلم وستم اور کشمیر کے حالات و واقعات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔جن میں خصوصاً افسانہ ''یہ تنگ زمین''،''باپ''،''مہمان''اور''برف گرنے والی''وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ترنم ریاض کے افسانوں میں عصرِ حاضر میں بھی حقیقت پسندی کا رنگ نمایاں طور پر ملتا ہے جو ترقی پسند تحریک کا ثبوت دیتا ہے۔

۱۶۔نور شاہ

ریاست جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگاروں میں ایک اہم اور بڑا نام نور شاہ کا ہے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ ''گلاب کا پھول'' لکھ کر کیا۔شروع شروع کے افسانوں میں رومانیت غالب تھی لیکن بعد کے افسانوں میں حقیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ان کے چھے افسانے مجموعے''بے گھاٹ کی ناؤ''،''ویرانے کے پھول''،''من کا آنگن اداس اداس''،''پتھروں کی مہک''،''بے ثمر سچ اور آسمان''اور''پھول اور لہو''منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے بیشتر افسانوں میں کشمیر کے لوگوں کا حسن

،مناظر اور ماحول، ٹنگمرگ، پہلگام اور پری محل وغیرہ کی عکاسی ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ غریب کشمیری مزدوروں کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے یعنی زیادہ تر سیاحوں کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر جان محمد آزاد اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نورشاہ کی کہانیوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیگر چیزوں کے علاوہ آج کے مجبور انسان کے روحانی بحران کو بھی اپنے ساتھ لے چلتی ہیں۔''

''کہانی ایک علیہ کی'' ان کی ایک شاہکار کہانی ہے جس میں غریبی، بے بسی اور لاچاری، انسان کا انسان کے ہاتھوں استحصال اور آفاقی نوعیت کے ایسے مسائل ہیں جس کی مثالیں ہر عہد اور خطے میں نظر آتی ہیں۔ نورشاہ نے اس کہانی میں علیہ نام کے ایک گھوڑے والی کی غریبی اور بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر کی سیر کو جانے والے سیاح جب پہاڑوں کی سیر کو جاتے ہیں تو اُن کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اُنہیں گھوڑے والے مزدوروں کی مدد چاہیے ہوتی ہے اور گھوڑے والے چندوں پیسوں کے لیے اپنی جان سے کھیل کر گھوڑوں کے ساتھ دوڑتے ہیں۔ افسانے کی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''علیہ تم تیزی سے مت دوڑو۔ لو میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوں صاحب کو جانے دو۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ شاید سمجھا ہوگا میں بھی کوئی بیوقوف سیاح ہوں جو اس کے دُکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' ۶۱

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح کشمیر کے لوگ اپنی جان سے کھیل کر دو وقت کی روٹی میسر کرتے تھے۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین نے اس طبقے کے مسائل کی طرف توجہ تو کی لیکن اہل کشمیر کے مسائل اُن کی نظروں سے اوجھل رہے بلکہ کشمیر کے ادیبوں کو ہی اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

نورشاہ ہماری ریاست کے نامور اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ صنفِ افسانہ کے ساتھ پردیسی، در،

ٹھا کر پونچھی اور پشکر ناتھ جیسے ادیبوں کی وابستگی کے باعث ریاست میں اردو افسانے کی روایت پروان چڑھی، نور شاہ اس کے سب سے بڑے معتبر ہیں۔عصر حاضر میں بھی ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

۱۷۔شبنم قیوم

شبنم قیوم اگر چہ پُرانے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں لیکن وہ آج بھی نئے لکھنے والوں کا ہم سفر بن کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔انہوں نے ۱۸ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ان کا پہلا افسانہ روز نامہ ''قدمت'' سرینگر سے شائع ہوا۔

شبنم قیوم کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ایک زخم اور سہی'' ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔اس میں کل پانچ طویل افسانے ہیں۔اس مجموعے کا پیش لفظ کرشن چندر نے لکھا ہے۔کرشن چندران کے افسانوں کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شبنم قیوم کو کہانی کا فن آتا ہے۔ان کے ہاں زندگی کا متنوع مشاہدہ موجود ہے اور اسے نفسیاتی طور پر جذب کرنے اور پھر فکر وفن کے سانچوں میں ڈھالنے کی قوت بھی اور واقعیت،اصلیت اور حقیقت کی عکاسی میں کہیں کہیں شاعرانہ انحراف کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔'' ۶۲

اس کے علاوہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''نشانات'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔شبنم قیوم نے سو(۱۰۰) سے زیادہ افسانے لکھے، جو''شیرازہ'' اور دیگر مقامی رسائل میں شائع ہوئے۔

شبنم قیوم کی کہانیاں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھر پور ہیں۔ان کے یہاں تجسس ہے، بات ہے اور انداز بھی ہے۔ان کے افسانے قاری کا تجسس برقرار رکھتے ہیں اور کہانی کو ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر

دیتے ہیں جہاں قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوجاتا ہے۔جس کا جواب جاننے کے لیے قاری بے قرار ہوجاتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر کشمیر کی خوبصورتی اور وہاں کے لوگوں کے مسائل کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔

''چھٹکارا'' ان کا ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں ایک غریب ادمی کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے جو اپنے دوستوں کو بڑے پیمانے پر دیکھ کر اِرادہ کرتا ہے کہ مجھے صبر اور محنت سے کام کرنا ہوگا تا کہ میں بھی اپنی بیوی اور بچوں کو خوش رکھوں۔ یہ سوچ کر سڑک پار کرتے ہی اس کی موت ہوجاتی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''وہ میری بیوی جس نے کبھی بھی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ بھوکی ہے، میرے بعد بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر نہ جائے۔میرے بچے میرے بعد بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہوجائیں۔لہٰذا مجھے اس حالت پر ہی قناعت کرنا چاہیے۔مجھے خدا پر بھروسہ کرکے آگے بڑھنا چاہیے۔مجھے زیادہ عزم کرنا چاہیے۔کبھی نہ کبھی ہمارے یہ بُرے دن دور ہوجائیں گے۔گھٹا ہمیشہ نہیں رہتی۔ مجھے عزم ہمت اور حوصلے سے آگئے بڑھ کر غربت اور ناداری کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ خودکشی بزدلی ہے۔ مجھے ایسی بزدلی کا خیال بھی ذہن میں نہیں لانا چاہئے۔''
>
> ۶۳؎

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر میں بھی غربت کے اثرات زیادہ پائے جارہے ہیں۔ بے روزگاری کے سبب انسان یا تو خودکشی کررہا ہے یا تو چوری لوٹ مار میں اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔شبنم قیوم نے ان مسائل کو قریب سے دیکھ کر حقیقت کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

شبنم قیوم کے افسانوں میں درد اور تڑپ ہے یہی درد اور تڑپ ان کے حقیقت پسند افسانہ نگار ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔

۱۸۔ زنفر کھوکھر

ریاست جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام زنفر کھوکھر کا ہے، ان کا تعلق راجوری سے ہے۔ ان کی پہلی کہانی ''نسخہ'' ہے۔ اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے'' کانچ کی سلاخ''، ''خوابوں کے اُس پار'' اور'' عبرت'' شائع ہو چکے ہیں۔

زنفر کھوکھر نے زیادہ تر مختصر کہانیاں لکھیں مگر جو بھی لکھا قابل تعریف ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں آس پاس کے ماحول کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی ایک مشہور کہانی ''واردات'' عصر حاضر کے حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ کہ کس طرح سڑک جام ہونے پر نعرہ بازوں پر پولیس لاٹھی چارج کرتی ہے اور اس سے عام انسان پر کیا اثرات پڑتے ہیں اس اقتباس سے ملاحظہ ہو:

> ''تین بے گناہ سویلین ہلاکتوں پر مقامی لوگ مشتمل ہو کر سڑک تک پہنچ آتے، نعرہ بازی ہوئی، ٹریفک جام ہوا، پہلے لاٹھیاں چلیں، پھر فائرنگ ہوئی، پانچ لوگ زخمی ہوئے اور ایک ہلاک ہوا تب جا کر ٹریفک بحال ہو گیا۔'' ۶۴؎

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زنفر کا یہ افسانہ موجودہ حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جیسے کہ (CAA) اور (NRC) کو لے کر نعرہ بازی ہو رہی ہے اس سے ملک میں خوف اور ڈر سا چھایا ہوا ہے۔ نعرہ بازی میں زیادہ تر طلب علموں کی تعداد ہے جس سے ان کے ذہن پر بُرا اثر پڑھ رہا ہے جس کی ذمہ دار موجودہ حکومت ہے۔ اس افسانے کو پڑھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ زنفر مستقل نظریہ رکھتی ہے۔ جس کا ثبوت ان کا یہ افسانہ ہے۔

اس طرح انہوں نے بہت سے افسانے لکھے مثلاً عبرت، تین وارداتیں اور کانچ کی سلاخ وغیرہ جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری پر نور شاہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زنفر کھوکھر اپنی کہانیوں میں آج کے سماج کی بداعمالیوں اور اقدار کی پامالیوں کا ذکر اپنے لب ولہجہ میں کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سادگی اور شائستگی بھی ہے۔ وہ ہٹ کر لکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور کامیاب نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے ظلم وستم، خواتین کے عدم تحفظ اور ناقص تعلیمی نظام کے خلاف بغاوت کرتی نظر آتی ہیں۔'' ۶۵؎

یہی وجہ ہے کی افسانوں کی دنیا میں زنفر کھوکھر کا مستقبل نہ صرف روشن ہے بلکہ ان کی ذات میں ایک نئی نسوانی آواز کی چیخ بھی سنائی دیتی ہے۔

۱۹۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ریاست جموں وکشمیر کے نئے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا ۱۹۹۹ء سے کیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا ''ہزاروں غم'' جو (۱۶) کہانیوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا ''میٹھا زہر'' جو (۱۲) کہانیوں پر مشتمل ہے اور حال ہی میں ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''اندر کی باتیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی بیشتر کہانیاں ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانوں میں رشوت خوری، جہیز اور تعلیم نسواں وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے نور شاہ لکھتے ہیں:

''وانی صاحب زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل اپنے افسانوں میں

ابھارنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔''۶۶

''میں تجھے آواز دیتا ہوں'' ان کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ جس کا موضوع دو پیار کرنے والوں کی سچی کہانی ہے۔ جس میں محبوبہ اپنے بچے کو جنم دینے سے پہلے ہی مر جاتی ہے اور مرنے سے پہلے اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ اس کی موت کے بعد وہ دوسری شادی کر لے۔ محبوبہ کی موت کے بعد اس کی جدائی میں محبوب کا کیا حال ہوتا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''شبینہ آج میرے دوست میرے پاس آئے تھے۔ مجھے دوسری شادی کے لیے آمادہ کرنے لیکن میں نے انکار کیا۔ اس قبرستان میں جہاں تم دفن ہو تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ تمہارے مرنے کے بعد بھی تم مجھ سے دور نہیں، میرے قریب ہو، میرے ساتھ ہو۔'' ۶۷

اس اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور شریں فراد کا سچا پیار زندہ ہے۔ اس تلخ حقیقت کو مشتاق احمد وانی نے اس افسانے میں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشتاق احمد وانی کو اس طرح کی کہانیاں بُننے کا فن بہ خوبی آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو اپنے ہی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی تحریک رہی ہے۔ اس تحریک نے ریاست میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کر لی تھی اور اس نے اردو ادب ہی نہیں بلکہ کشمیری، ڈوگری، گوجری اور پہاڑی ادب کو بھی نئی سمتیں عطا کیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں ادب کا کوئی سنجیدہ قاری اس کے تاریخی اور افادی رول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

******

حوالہ جات

۱۔ سلیم سالک، جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے، (جلد اوّل)، میزان پبلیشر زبٹہ مالو، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۔

۲۔ محمد یوسف ٹینگ، ہمارا ادب، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر، سرینگر (انتخاب۔ نمبر ۹۷)، ۱۹۸۷ء، ص ۳۴۲۔

۳۔ غلام محمد صادق، بہتے چراغ، مکتبہ لالہ رُخ، سرینگر، ۱۹۵۵ء، ص ۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۸۔ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۷۔

۹۔ نورشاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۴۴۔

۱۰۔ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۷۔

۱۱۔ برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما، رچنا پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۱۳ء، ص ۲۹۔۳۰۔

۱۲۔ پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، فنکار کلچرل آرگنائزیشن، سرینگر، ۱۹۹۱ء، ص ۲۔

۱۳۔ جی۔آر۔حسرت گڑھ، چناروں کے سائے میں، (در کے افسانے)، لال بازار سرینگر، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۹۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۲۱۔

۱۵۔ عبادت بریلوی، تنقیدی زاویے، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۶۵۔

۱۶۔ کرشن چندر، طلسم خیال، وجے مارکیٹ، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔

۱۹ کرشن چندر، نئے افسانے، پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۴۱ء، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔

۲۰ برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما، رچنا پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۱۔

۲۱ کشمیری لال ذاکر، جب کشمیر جل رہا تھا، اردو بازار، دہلی، ۱۹۴۷ء، ص ۷۔

۲۲ ایضاً، ص ۱۰۔

۲۳ ایضاً، ص ۲۰۔

۲۴ ایضاً، ص ۲۱۔

۲۵ ایضاً، ص ۳۱۔

۲۶ نور شاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۵۷۔

۲۷ محمد اشرف ٹاک، شیرازہ، (افسانہ نمبر ۱۲، ۳۱)، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر، سرینگر، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۔

۲۸ نور شاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۵۸۔

۲۹ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۳۷

۳۰ نور شاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۴۸۔۔

۳۱ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۹۶۔

۳۲ ایضاً، ص ۴۹۷۔

۳۳ ایضاً، ص ۴۳۷۔

۳۴ نور شاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۵۷۔

۳۵ سلیم سالک، جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے، (جلد اوّل)، میزان پبلیشرز بٹہ مالو، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۵۲۔

۳۶ ایضاً، ص ۵۴۔

۳۷ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۱۔

۳۸ محمد اشرف ٹاک، شیرازہ گولڈن جبلی (شمارہ ۵ تا ۸)، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر، سرینگر، ۲۰۱۳ء، ص ۵۰۰۔

۳۹ ایضاً، ۵۰۰۔

۴۰۔ موہن یاور، توی اور جہلم جے۔ کے۔ بُک ہاؤس، جموں، ۱۹۶۲ء، ص ۶۸۔
۴۱۔ موہن یاور، سیاح تاج محل، سندیش پبلیکشنز، جموں، ۱۹۶۱ء، ص ۲۸۔
۴۲۔ ایضاً، ص ۳۰۔
۴۳۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۴۶۵۔
۴۴۔ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۹۔
۴۵۔ نورشاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۶۲۔
۴۶۔ حامدی کشمیری، وادی کے پھول، شاہین بُک سٹال، سرینگر، ۱۹۵۷ء، ص ۴۔
۴۷۔ ایضاً، ص ۴۷، ۵۷۔
۴۸۔ سلیم سالک، جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے، (جلد اوّل)، میزان پبلیشر زبٹہ مالو، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۵۹
۴۹۔ نورشاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱
۵۰۔ جوہر قدوسی، قدرت اللہ شہاب (ماں جی، یا خدا اور دیگر کہانیاں)، کشمیر بُک فاوڈیشن، ۲۰۱۲ء، ص ۶
۵۱۔ نورشاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۴۳
۵۲۔ برج پریمی، سپنوں کی شام، دیپ پبلی کیشنز، جموں، ۱۹۹۵ء، ص ۹۔
۵۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔
۵۴۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔
۵۵۔ ڈاکٹر شمیم احمد، کشمیر کے تیرہ افسانے، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۵۶۔
۵۶۔ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۹۰۔
۵۷۔ ایضاً، ص ۴۱۲۔
۵۸۔ محمد اشرف ٹاک، شیرازہ، (افسانہ نمبر ۱۲، ۳۱)، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر، سرینگر، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۔
۵۹۔ نورشاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۸۔
۶۰۔ ترنم ریاض، یمبرزل۔ نرالی دنیا پبلیکشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۶۔

۶۱۔ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی،۲۰۰۴ء، ص۱۹۰۔

۶۲۔ ڈاکٹر شمیم احمد، کشمیر کے تیرہ افسانے، ایم۔آر، پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص۱۴۔

۶۳۔ جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی،۲۰۰۴ء، ص۲۶۶۔

۶۴۔ سلیم سالک، جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے، (جلد اوّل)، میزان پبلیشرز بٹہ مالو، سرینگر،۲۰۱۱ء، ص۱۰۶۔

۶۵۔ نور شاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سرینگر،۲۰۱۱ء، ص۱۷۰۔

۶۶۔ ایضاً، ص۱۷۰۔

۶۷۔ ایضاً، ص۱۷۴۔

******

ماحصل

علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری بڑی تحریک جس نے ہمارے ادب کو انقلابی تبدیلیوں سے دو چار کیا وہ ترقی پسند تحریک تھی۔اس تحریک کے زیر اثر اردو ادب کو کافی فروغ ملا۔کئی ادیب،شاعر اور نقاد اس تحریک سے وابستہ رہے اور اردو ادب کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے سلسلے میں انقلاب روس کا واقعہ تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔اس واقعہ نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔دوسرے مما لک کی طرح ہندوستان پر بھی اس واقعہ کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں تیزی کی لہر دوڑ گئی۔دوسری جنگ عظیم کے بعد پورے مغرب میں مایوسی کی فضا چھانے لگی۔جس کی بنا پر حساس نوجوان طبقہ میں اشترا کی رجحانات پیدا ہونے لگے۔

شاعروں اور ادیبوں نے ٹالسٹائی کے برعکس لینن اور کارل مارکس کے اثر کو قبول کیا۔جب کہ روسی ادب کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کی حیثیت افیون کی سی ہے۔ان کے نزدیک مذہب باطل تصور ہے ۔انسان کے سب سے بڑے مسائل معاشی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔اس طرح ادب کی روح سے تعلق جوڑتا ہوا مذہب انسانیت ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ نظریات ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سبب بنے۔

اس مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول میں ''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز و ارتقا'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم میں نمائندہ افسانہ نگاروں کے حوالے سے ''اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے اثرات'' کے تحت جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں ''جموں وکشمیر کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ترقی پسند تحریک کا سرچشمہ انقلاب

روس تھا۔لندن میں مقیم چند نوجوانوں کے ایک گروہ نے ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی جلسے کا اہتمام کیا۔اس جلسے میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر پرمود سین گپتا، اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔انھوں نے ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن قائم کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔جس کا پہلا جلسہ لندن کے نان کنگ ریستوران میں منعقد ہوا اور اس انجمن کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' (Indian Progressive Writer's Association) رکھا گیا۔

اسی دوران یورپ کے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی فاشزم کے مقابلے کے لیے دنیا کے ادیبوں کی کانفرنس طلب کی۔اس کانفرنس میں ساری دنیا کے ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کی گئی کہ وہ فسطائی اور سامراجی طاقتوں کے ظلم سے انسانیت کو بچانے کے لیے اپنے قلم اور فن کی قوت سے کام لیں۔ اس کانفرنس میں برطانوی سامراج کی شدید مذمت کی گئی کہ وہ ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔

اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے قبضوں سے نکال کر عوام کے قریب لایا جائے۔انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے تاکہ ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔

ترقی پسند تحریک کو ماننے والے اس بات پر بھی اتفاق کرتے تھے کہ وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایت کو بھی عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہیں گئے۔

ان خیالات کو ہندوستان میں سب سے پہلے پریم چند نے قبول کیا اور اسے اپنے رسالہ ''ہنس''

میں شائع کر کے ایک اداریہ لکھا جس میں ان مقاصد کی حمایت کی اور کہا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ بظاہر ترقی پسند تحریک کے مقاصد ایسے تھے جس سے کسی ادیب یا شاعر کو اختلاف نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کی ہندوستانی اکیڈمی کانفرنس الہ آباد میں مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے اس مینی فسٹو پر دستخط کئے۔ الہ آباد میں ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے ساتھ ہی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک اردو کی اہم ترین تحریکوں میں سے ایک تھی جس نے اردو کو چوٹی کے ادیب، شاعر اور نقاد دیئے۔ اس نے ایک طرف معاشی اور سماجی نابرابری کے خلاف آواز اُٹھائی تو دوسری طرف آزادی کی تحریک میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ جس نے ادبی تصورارت پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ اس تحریک سے جو اصناف متاثر ہوئیں، اُن میں خاص طور پر افسانہ، شاعری اور تنقید قابلِ ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے دوسری اصناف کے مقابلے میں اردو افسانے کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ترقی پسند اردو افسانے کے ابتدائی نقوش پریم چند اور افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک کا اعلان اور منشور ترتیب دینے والوں میں بیشتر افسانہ نگار پیش پیش تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک اور اس کے مقصد کے تحت افسانہ فی الحقیقت زندگی کے مسائل کا ترجمان بنا۔ اس میں جمہوریت، آزادی، اشتراکیت، غلامی، آمیریت، مذہبی اجارہ داری، طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، نسلی برتری، نفسیاتی اور جنسی اُلجھن وغیرہ جیسے زندگی کے سبھی گوشے زیرِ بحث آئے۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ ان ادیبوں نے اپنے افسانوں

میں ملکی موضوعات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی موضوعات کوجگہ بھی دی اور دنیا بھر کے دبے کچلے لوگوں کی زندگی اور مسائل کو موضوع بنایا۔غرض ترقی پسند افسانے نے تعصّبات کی دُھند کو صاف کیا اورعوام دوستی کی مثال قائم کرتے ہوئے ان کے حقوق کا تحفظ کیا اور انھیں اپنی خودی کا احساس دلایا۔

ترقی پسند تحریک کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، اختر حسین رائے پوری، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، دیویندر سیتارتھی، مہندر ناتھ، ہنس راج رہبر وغیرہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔اس مقالے کے دوسرے باب میں مذکورہ بالا نمائندہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر ترقی پسند افسانے کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو افسانے کو ترقی دینے میں جن افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے، اُن میں ایک اہم نام کرشن چندر کا ہے۔کرشن چندر اس تحریک کے اہم رکن تھے۔اُنہوں نے ۱۹۳۶ء میں لکھنا شروع کیا۔ ترقی پسند تحریک کا اور کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا دور تقریباً ایک ہی رہا ہے۔ابتدا میں وہ رومانی طرز کے افسانے لکھا کرتے تھے۔اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''طلسم خیال'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔اس میں جو افسانے شامل ہیں اُن میں رومانیت غالب ہے۔ان افسانوں کا موضوع جھیلیں، جنگل، مہکتے پھول، پرندے شمشاد وصنوبر کے نرم و نازک سائے، سرسراتی ہوائیں، پورے چاند کی رات وغیرہ ہیں۔کرشن چندر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''نظارے'' ہے۔جس میں انھوں نے رومان کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری پر بھی زور دیا ہے۔''زندگی کے موڑ پر''، ''دوفرلانگ لمبی سڑک''، ''ٹوٹے ہوئے تارے''، ''بالکنی''، اور ''جنت وجہنم'' ان سبھی افسانوں میں ہمارے آس پاس کے سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔مجموعی طور پر کرشن چندر نے ان افسانوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ منظر نگاری اور جذبات

نگاری کے عمدہ نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔

کرشن چندر کے علاوہ منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور احمد ندیم قاسمی نے بھی حقیقت نگاری کے زیر اثر اپنے افسانوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے بہترین عناصر اور اقدار کے تقریباً تمام پہلو اُجاگر کیے۔غرض ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جہاں ایک طرف اپنی حقیقت نگاری کے زیر اثر ادبی اور سیاسی مسائل کی حقیقی اور فن کارانہ پیش کش سے اپنے عہد کے تقاضوں اور اپنے منصبی فرائض کو ادا کیا ہے، دوسری طرف انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہم عصر سماجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر کے مشترکہ تہذیب وثقافت کی تاریخ بھی قلم بند کی ہے۔اسی لیے اردو افسانے کی تاریخ میں یہ دور اپنی سماجی خدمات کے لحاظ سے نمایاں نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے باقاعدہ آغاز کے بعد چند برسوں میں ہی اس تحریک نے ملک کے تقریباً ہر حصے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔اُس وقت ریاست جموں وکشمیر نہ ہی اردو کا علاقہ تھا اور نہ ہی اردو یہاں کے لوگوں کی زبان تھی۔لیکن پھر بھی یہاں کے ادیبوں نے اس زبان کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔اس زمانے میں ریاست جموں وکشمیر میں سیاسی سطح پر زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔مقامی طور پر مسلم کانفرنس کشمیر کی بڑی سیاسی جماعت تھی۔جو بعد میں نیشنل کانفرنس کے نام سے عمل میں آئی۔جس کی قیادت شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں تھی۔اس جماعت نے جو سیاسی عمل اپنایا اُسے قومیت کا نام دیا گیا اور اس کے ڈانڈے ہندستان کی تحریک آزادی سے ملا لیئے۔چنانچہ ریاست میں ڈوگرہ شاہی کے استحصال اور ضد کے خلاف آواز بلند ہوئی اور اس جماعت کی قیادت نے غلامی، افلاس، اور ناداری کے خلاف جنگ لڑی۔

اُسی زمانے میں پریم ناتھ سادھو رونق کے نام سے ایک نوجوان ادیب اردو ادب کے حلقوں میں اُبھر رہا تھا جو بعد میں پریم ناتھ پردیسی کے نام سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔یہی پریم ناتھ پردیسی اپنے افسانوں کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگار قرار

پایا۔ پردیسی نے نہ صرف اس استحصال کے خلاف لکھنا شروع کیا، بلکہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن بھی تشکیل دی، جس کا نام حلقہ ارباب ذوق رکھا۔ جو اُس صدی کے چوتھے دہے کے شروع میں عمل میں لائی۔ اس انجمن کا کوئی تعلق اُس حلقہ ارباب ذوق سے نہ تھا جس کے بانی نصیر احمد جامی اور اُن کے رفقا تھے بلکہ دونوں کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کشمیر کے نوجوان ادیبوں کا یہ حلقہ پریم ناتھ پردیسی کے مکان تک ہی محدود رہا، اس انجمن میں شامل پریم ناتھ پشپ، پریم ناتھ در، قیصر قلندر، سوم ناتھ زتشی، مرزا عارف بیگ وغیرہ تھے جو اس انجمن میں کہانیاں اور شعر سنایا کرتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا اور انجمن کا شیرازہ بکھر گیا۔ کچھ عرصہ بعد راما نند ساگر جن کا وطن کشمیر تھا، پردیسی کے قریب آئے اور پردیسی کو ترقی پسند تحریک کی شاخ کھولنے پر آمادہ کیا۔ پردیسی اور راما نند ساگر نے ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کو منظّم کرنے میں وہی مساعی کی جو سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے ہندوستان کے باقی حصوں میں کی تھی۔ آہستہ آہستہ اس تحریک کا اثر پھیلتا گیا۔ بیرون ریاست سے آنے والے ترقی پسند شعراء اور ادبا نے اس انجمن میں شریک ہوکر نوجوان فنکاروں کی حوصلہ آفزائی کی جس سے اس تحریک کو کافی فائدہ ہوا۔ ان تمام محفلوں کی بدولت ریاست جموں وکشمیر میں اس چھوٹی سی تحریک نے ایک ہمہ گیر ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس سے بنیادی مسائل پر غور وفکر ہونے لگا جن کا ذکر انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اعلان نامے میں ہوا تھا۔ اس طرح یہ تحریک پروان چڑھی اور ہندوستان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب بھی اس تحریک میں شامل ہوئے۔ جن میں بیدی، خواجہ احمد عباس، دیویندر ستیارتھی وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ فکشن کے حوالے سے خاص طور پر پریم ناتھ پردیسی اور راما نند ساگر کے علاوہ ٹھاکر پونچھی، کشمیری لال ذاکر، علی محمد لون، موہن یاور وغیرہ نے اُس دور کے ڈوگرہ شاہی استحصال کو موضوع بنا کر اردو فکشن میں جان ڈالی۔ شاعری میں پردیسی کے علاوہ پیر عبداللہ

،غلام رسول ریئزؔ و،نور محمد موتی لال مصریؔ ، پروانؔ ناتھ جلالی اور ماسٹر زندہ کولؔ وغیرہ نے اُس دور کے سماجی و سیاسی اور اقتصادی حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ترقی پسند تحریک کی بے حد خدمت کی ،جس سے اس تحریک کو فروغ ملا اور بڑے بڑے ادیب اور شاعر اُبھر کر سامنے آئے ۔یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی تحریک رہی ہے۔اس تحریک نے ریاست جموں وکشمیر میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کی جس سے کشمیری ادبیات ہی نہیں بلکہ ڈوگری اور لداخی ادب کی بھی نئی سمتیں متعین کیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب ریاست ڈوگرہ تانا شاہی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔جاگیرداری نظام کی صعوبتوں نے زندگی بے کیف کر رکھی تھی۔غربت،افلاس،پسماندگی،معاشی،اقتصادی،بدحالی،طبقاتی کشمکش اور بیکاری کی لعنت جاگیردارانہ نظام کی دین تھی۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے اس پہلے دور کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر پونچھی، گنگادھر بھٹ اور کوثر وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی ریاست جموں وکشمیر کے صفِ اول کے ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔اُنھوں نے ۱۹۳۶ء سے لکھنا شروع کیا تھا شروع شروع میں یلدرم سے متاثر تھے۔لیکن بعد میں راہِ حقیقت کی طرف متوجہ ہو کر رومان پسندی کو چھوڑ کر اپنا رُخ بدل دیا۔

اُس دور میں لکھے گئے پردیسی کے کئی نمائندہ افسانے ہیں جن کے موضوعات صرف کشمیر سے لیے گئے ہیں ۔ان افسانوں میں کشمیریوں کا دُکھ درد، آرزوئیں اور ان کے ساتھ ہو رہے مظالم کو پوری

حقیقت آمیزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جیسے، کتبے، کاغذ کی جھنڈیاں، جواری، خون اور سکے، جہاں سرحد ملتی ہے، جھنجھنا، بہتے چراغ، کاریگر، ڈھول، اگلے سال، دیوتا کہاں ہیں، سیلز مین یہ سب اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔

اُس دور کے ایک اور اہم افسانہ نگار پریم ناتھ درؔ ہیں۔ افسانہ نگاری کی دنیا میں پریم ناتھ درؔ دیر سے داخل ہوئے لیکن جو بھی لکھا قابلِ تعریف ہے۔ پریم ناتھ درؔ کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں پہلا افسانوی مجموعہ ''کاغذ کا واسدیو'' جو حلقہ ارباب ذوق دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں اُنھوں نے کشمیر کی سماجی زندگی کی اچھی طرح عکاسی کی ہے۔ درؔ نے بھی پردیسیؔ کی طرح کشمیر کے مناظر کا ذکر بہت کم کیا بلکہ یہاں کے لوگوں پر جاگیردارنہ نظام سے پھیلی بُرائیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں درؔ کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہی ہوتا ہے اور وہ اس تحریک کے روح رواں بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادھے انداز میں عوام کے مختلف مسائل کو اُبھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثلاً غربت، جہالت، غلامی، طبقاتی کشمکش اور بیکاری وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔

کشمیری لال ذاکر ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے افسانہ نگار تھے۔ جنہوں نے کشمیر میں رہ کر ترقی پسند تحریک اور کشمیر کی آزادی کے حوالے سے شاید سب سے زیادہ افسانے لکھے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کے لاشعور میں ہمیشہ کشمیر بسا رہا ہے۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''جب کشمیر جل رہا تھا'' ۱۹۴۷ء شائع ہوا۔ اس مجموعے کی لگ بھگ سبھی کہانیاں قبایلی حملے کے پس منظر میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ذاکرؔ کے افسانوں کے کئی مجموعے منظر عام میں آتے گئے جن میں ''یہ کھنڈر میرے ہیں'' اس کے علاوہ تین کہانیاں ''چراغ کی لو''، ''اُداس شام کے آخری لمحے''، بیریوں والا

فقیر'' اور ''ایک کرن روشنی کی'' وغیرہ کشمیری عوام کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کے علاوہ، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، کرشن چندر، تیج بہادر بھان، برج پریمی، موہن یاور، حامدی کشمیری، اختر محی الدین، رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب اور نرسنگھ داس نرگس وغیرہ کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔

راقم الحروف نے ریاست جموں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک کے عہد کے چودہ (۱۹) افسانہ نگاروں کے یہاں اس تحریک کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء تک ہی متعین کیا جاتا ہے لیکن اس دوران ملک تقسیم ہوجاتا ہے اور ہماری ریاست کے بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے جاتے ہیں۔ جن میں قدرت اللہ شہاب، کوثر سیمابی، محبوبہ یاسمین، محمد عمر نور الٰہی، طالب گورگانوی، شیخ منظور اور گلزار احمد فدا وغیرہ پاکستان چلے گئے اور رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، جگدیش کنول، کندل لال، ٹھاکر پونچھی اور پریم ناتھ در وغیرہ ملک کے دیگر حصوں میں جا کر رہائش پذیر ہوگئے۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ادیب تھے جنہوں نے ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا اور ان کی فنی قدریں بھی متعین نہیں ہوئی تھیں۔ بعض کی تخلیقات اب نایاب ہیں جس کی وجہ سے ان کے بارے میں اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ زندگی کے تقاضے بدل گئے اور حالات کو معمول پر آنے میں وقت لگ گیا۔ ترقی پسند تحریک جو بڑے پیمانے پر عوام کی کفالت کر رہی تھی زوال پذیر ہوگئی، ادیب و شاعر بھی اس سے بیزار ہوگئے۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی تحریک و رجحان ایک ساتھ پنپ کر سامنے نہیں آتا ہے اور نہ اس کے اثرات ختم ہوتے ہیں۔ البتہ وقت اور زمانے کے تقاضے نئے نظریے وجود میں لائے اور پُرانے نظریے کے مقرر شدہ زاویوں سے خلط ملط ہوکر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کے اثرات سرے سے ختم

نہیں ہوئے بلکہ عصرِ حاضر میں بھی اس تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔عصرِحاضر کے افسانہ نگاروں میں نورشاہ ،ترنم ریاض، شبنم قیوم ،زنفر کھوکھر ،مشتاق احمد وانی وغیرہ کے افسانے ترقی پسند تحریک کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی تحریک رہی ہے۔اس تحریک نے ریاست میں ایک ہمہ گیراور ہمہ جہت صورت اختیار کر لی تھی اوراس نے اردوادب ہی نہیں بلکہ کشمیری، ڈوگری، گوجری اور پہاڑی ادب کوبھی نئی سمتیں عطا کیں۔یہی سب ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں ادب کا کوئی سنجیدہ قاری اس کے تاریخی اورافادی رول سے انکارنہیں کرسکتا ہے۔

******

کتابیات

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
1	اسلم جمشید پوری	ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار	نئی دہلی	2002ء
2	اطہر پرویز	اردو کے تیرہ افسانے	(اشاعت اول) علی گڑھ	1983ء
3	برج پریمی	جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو نما	رچنا پبلی کیشنز، جموں	2013ء
4	پریم ناتھ در	چناروں کے سائے میں	فنکار کلچرل آرگنائزیشن، سرینگر	1957ء
5	جان محمد آزاد	جموں و کشمیر کے اردو مصنفین	میکاف پرنٹرس، دہلی	2004ء
6	جوہر قدوسی	قدرت اللہ شہاب (ماں جی، یا خدا اور دیگر کہانیاں)	کشمیر بک فاوڈیشن	2012ء
7	حامدی کشمیری	انصاری بازیافت	شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی، سرینگر	1982ء
8	حیات اللہ انصاری	بھرے بازار میں	مکتبہ اردو، لاہور	1946ء

9	خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	(تیسرا ایڈیشن) علی گڑھ	1984ء
10	راجندر سنگھ بیدی	دانہ ودام	دہلی	1980ء
11	سجاد ظہر	روشنائی	سٹی ٹاور، لاہور	2006ء
12	سلیم سالک	جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے	میزان پبلیشرز، بٹہ مالو، سرینگر	2011ء
13	شمیم احمد ڈاکٹر	کشمیر کے تیرہ اردو افسانے	نئی دہلی	1995ء
14	عصمت چغتائی	عصمت چغتائی کے یادگار افسانے	لاہور	1984ء
15	عبادت بریلوی	تنقیدی زاویے	لاہور	1951ء
16	عبدالقادر سروری	کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)	نئی دہلی	1984ء
17	قاسم ظفر خان ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری	بہار	1996ء
18	قمر رئیس	ترقی پسند افسانے کے پچاس سال	علی گڑھ	1995ء

19	قمر رئیس	نیا افسانہ، مسائل اور میلانات	اردو اکیڈمی، دہلی	1992ء
20	کرشن چندر	نئے افسانے	پرنٹنگ ورکس، دہلی	1941ء
21	کشمیری لال ذاکر	جب کشمیر جل رہا تھا	اردو بازار، دہلی	1947ء
22	گیان چند جین	اردو کی ادبی تحریکیں	انجمن اردو، پاکستان، کراچی	2000ء
23	گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ روایت اور مسائل	(اشاعت دوم) دہلی	2000ء
24	لیاقت علی	جموں وکشمیر میں اردو ادب	میزان پبلیشرز	2017ء
25	محمد اشرف ٹاک	شیرازہ، افسانہ نمبر	اردو کلچر اکیڈمی سرینگر	2016ء
26	محمد صادق ڈاکٹر	ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ (اشاعت اول)	دہلی	1981ء
27	موہن یاور	توی اور جہلم	جے۔ کے بک ہاؤس، جموں	1982ء
28	موہن یاور	سیاح تاج محل	سندیش پبلیکشنز ،جموں	1961ء
29	نور شاہ	جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار	میزان پبلیشرز ،سرینگر	2011ء

30	وقار عظیم	نیا افسانہ	ایجوکیشنل بُک ہاؤس ،دہلی	1990ء

*****